اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

خبرنامہ

ماہنامہ اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ

مارچ ۲۰۲۵ء

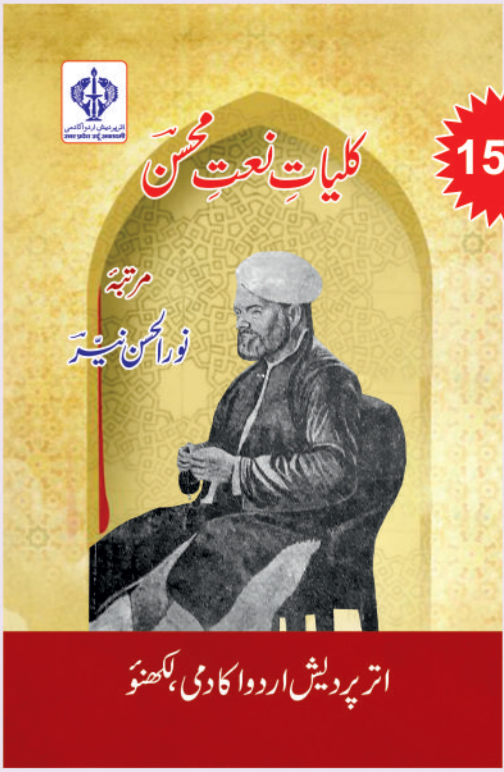

150/-

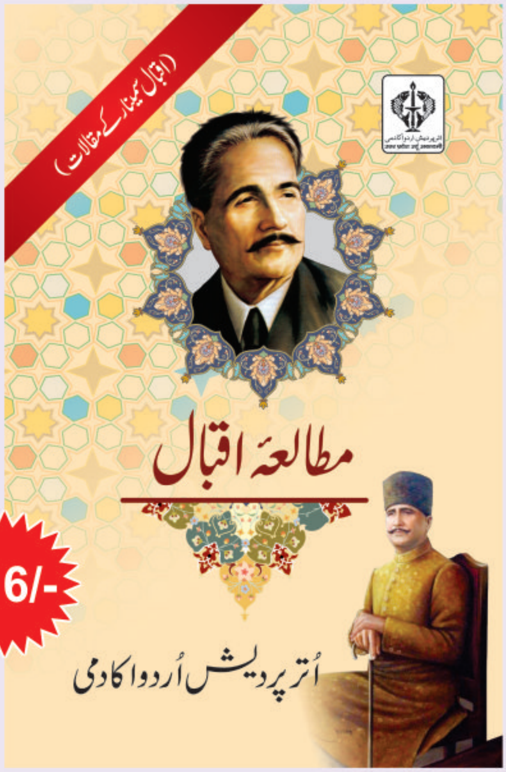

116/-

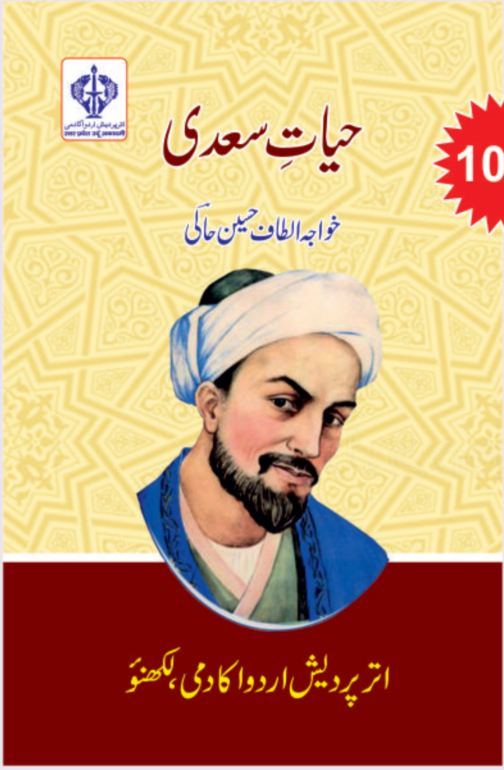

100/-

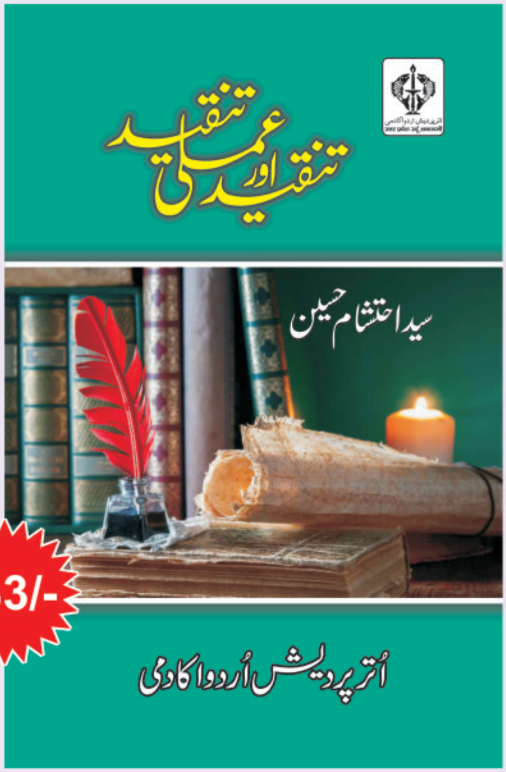

183/-

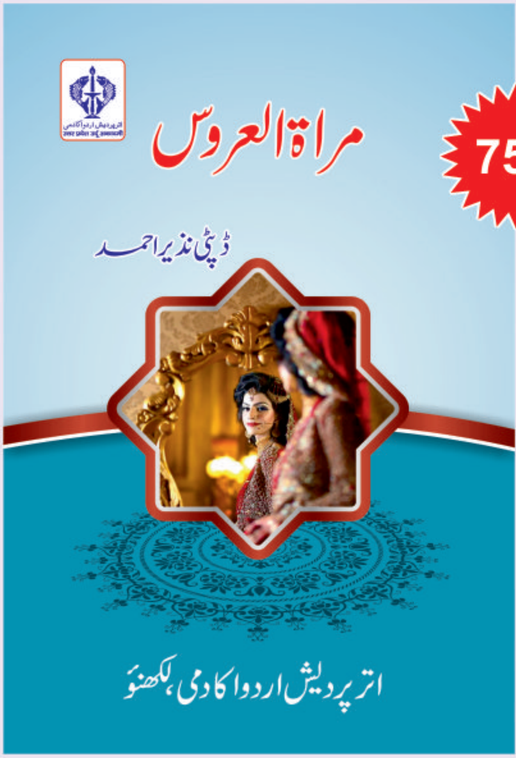
مراۃ العروس
ڈپٹی نذیر احمد
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

-/75

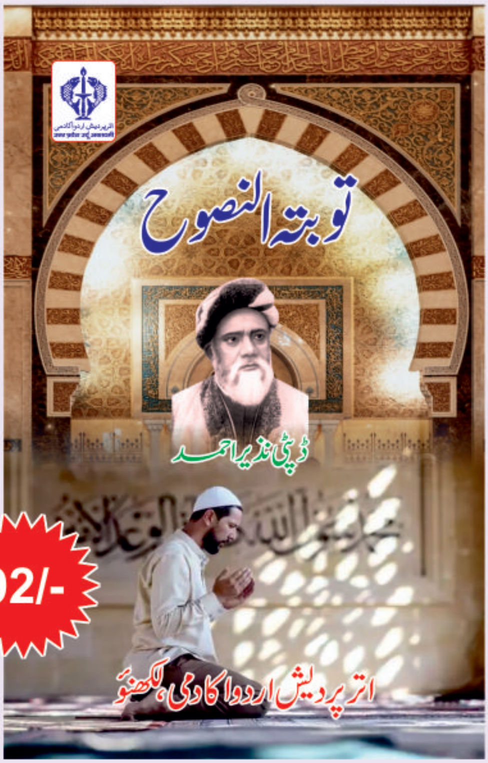
توبۃ النصوح
ڈپٹی نذیر احمد
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

-/92

بنات النعش
ڈپٹی نذیر احمد
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

-/83

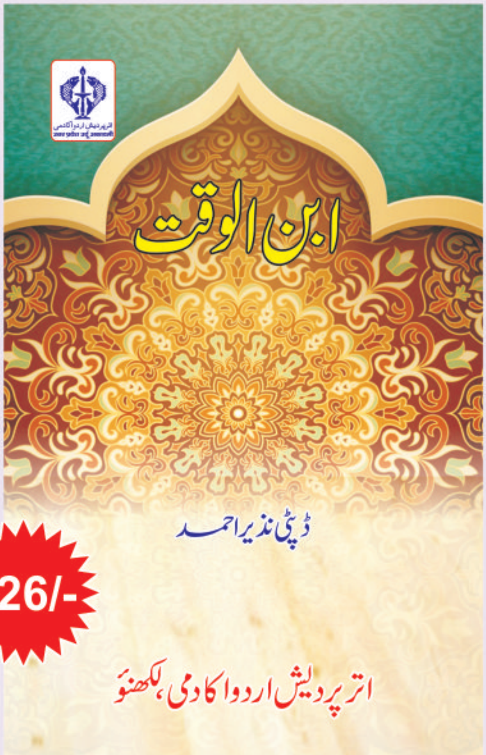
ابن الوقت
ڈپٹی نذیر احمد
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

-/126

اترپردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

مارچ ۲۰۲۵ء

جلد : ۵۳ شمارہ : ۹

ایڈیٹر : شوکت علی (سکریٹری)

معاون : ممتاز احمد (سپرنٹنڈنٹ)

زرسالانہ : پچاس روپے-/50

قیمت فی شمارہ : پانچ روپے-/5

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ

گومتی نگر، لکھنؤ-226010

فون نمبر 0522-4022924

شوکت علی، سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۰۲
اعظم اثر کی نظم نگاری	پروفیسر مقبول احمد مقبول	۰۳
غزل	یسریٰ راحت	۰۶
مرلی دھر طالبؔ کی غزلیہ شاعری	ڈاکٹر محبوب حسن	۰۷
غزل	صدام غنی	۱۱
غزل	ڈاکٹر مخمور کاکوروی	۱۱
سدابہار نغمہ نگار: آنند بخشی	سعدیہ صدف	۱۲
روٹھنا (انشائیہ)	الیس معشوق احمد	۱۸
شبلی نعمانی کی مکتوب نگاری	ڈاکٹر اطہر حسین	۲۰
بنجر پور کا قبرستان (افسانہ)	فاضل شفیع بھٹ	۲۴
غزل	فریدہ انجم	۲۸
غزل	ڈاکٹر اطہر صغیر	۲۸
بزم رفتہ	مبصر: ڈاکٹر محمد سعید اختر	۲۹
علمی وادبی خبریں	ادارہ	۳۱
قارئین کے خطوط	قارئین	۳۲

اداریہ

عصر حاضر میں اردو کے ادبی رسائل کا حال کسی سے چھپا نہیں ہے۔ اگر ادبی رسائل کا جائزہ لیا جائے تو اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ نئے نئے رسائل کا اجرا اہتمام اور خوش اسلوبی سے کیا جاتا ہے لیکن قارئین کی بے توجہی اور بے خبری سے دھیرے دھیرے ان کی آب وتاب ختم ہو جاتی ہے۔ ان باتوں کا ذکر کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ اردو زبان وادب سے قارئین کی دلچسپی ختم ہوتی جارہی ہے۔ ظاہر ہے وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں جو اپنی زبان اور تہذیب کو زندہ رکھتی ہیں۔ اردو زبان وادب سے عام افراد کو جوڑنے کے لئے تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ جن کے اندر بھی اردو سے محبت کا جذبہ ہوگا وہ اس تحریک سے وابستہ ہوکر محلّہ محلّہ اور گاؤں گاؤں اردو پڑھاؤ تحریک چلا کر اپنی مادری زبان کا فروغ کریں گے۔

یہاں دو باتوں پر غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر رسائل سے قارئین کی دوری کے اسباب کیا ہیں۔ پہلی یہ کہ قارئین کو اردو کے مستقبل کی فکر نہیں اور مطالعہ کے ذوق وشوق میں کمی۔ دوسرے ان تک رسالوں کی رسائی نہ ہونا۔ اگر محبان اردو ہی ان رسائل کی خریداری قبول فرمالیں تو یقیناً سرکولیشن میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہاں آپ کا ذہن ایک مسئلہ کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ زیادہ تر سالانہ خریداروں تک محکمہ ڈاک کی لاپروائی کی وجہ سے رسائل پہونچ نہیں پاتے کیونکہ پوسٹ مین اب صرف رجسٹرڈ ڈاک کو ہی پہنچانا اپنی ذمہ داری سمجھنے لگے ہیں، سادہ ڈاک کہاں غائب ہو جاتی ہے پتہ ہی نہیں چلتا۔ زیادہ تر رسائل غائب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے رسائل کے سرکولیشن کو بڑھانے کے لئے کوئی لائحہ عمل بنانا ہوگا۔ مختلف شہروں میں جہاں اردو قارئین کی خاصی تعداد ہے وہاں سنٹر قائم کئے جائیں تاکہ سنٹر سے قارئین کو پرچہ آسانی سے دستیاب ہو سکے یا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ رسائل کو رجسٹرڈ ڈاک سے منگوانے کی پہل کریں۔ اگر اردو کے ادبی رسائل کے سرکولیشن پر توجہ نہ دی گئی تو مستقبل قریب میں سرکاری و نیم سرکاری ادبی رسائل کا حال بھی غیر سرکاری ادبی رسائل جیسا ہو سکتا ہے۔ اس لئے تمام محبان اردو سے اپیل ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اردو کے ادبی رسائل کے خریدار بنیں اور جن شہروں کے بک اسٹالوں پر رسائل دستیاب ہیں وہاں سے رسالہ ضرور خریدیں۔ اپنے گھر میں اردو رسائل ضرور منگائیں، تاکہ مستورات اور بچے بھی ان رسائل سے فیض یاب ہو سکیں۔

۸ مارچ کو یوم خواتین منایا جاتا ہے۔ اردو زبان وادب سے وابستہ خواتین اپنی دیگر ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ اردو ادب کی خدمات بھی انجام دے رہی ہیں۔ شاعری ہو یا افسانوی ادب، طنز و مزاح ہو یا ادب اطفال پیش پیش رہتی ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی اور صحافتی میدان میں بھی خواتین بھرپور حصہ لے رہی ہیں۔ تمام خواتین کو یوم خواتین پر ادارہ مبارکباد پیش کرتا ہے۔

خبرنامہ کے اس شمارہ میں تنقیدی مضامین، انشائیہ، افسانہ اور غزلوں کے ساتھ ہی کئی مستقل کالم حسب روایت شامل ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس شمارہ کے مشمولات پر اپنے تاثرات اور گراں قدر مشورے سے نوازیں تاکہ اس کی روشنی میں خبرنامہ کو مزید بہتر کیا جا سکے۔

شوکت علی

ایڈیٹر

پروفیسر مقبول احمد مقبول

مہاراشٹر

اعظم اثر کی نظم نگاری

اعظم اثر کرناٹک کے معروف اور زود گو شاعر گزرے ہیں۔ ان کی شعری و ادبی خدمات ساٹھ برسوں سے زائد مدت پر مشتمل ہیں۔ ان کا اصل نام ابوالمحاسن محمد اعظم ہے۔ موصوف کی پیدائش ۱ر مارچ 1931ء کو ضلع گلبرگہ (موجودہ نام کلبرگی) کے تعلقے شاہ پور میں ہوئی۔ ان کا تعلق شاہ پور کے ایک علمی اور مذہبی خاندان سے تھا۔ اعظم اثر کے دادا وکیل تھے اور والد ذبیح پیشہ و تدریس سے وابستہ تھے۔ ان کا نتقال 8ر اکتوبر 2020ء کو ہوا۔ اعظم اثر کے سات شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کے نام یہ ہیں: (1) زخمِ آ گہی (2) متاعِ آ گہی (3) رشتوں کا درد (4) موسموں کی سرحدیں (5) اجالے تبسم کے (6) فیضانِ رسولِ رحمت (7) سوچ کا سایہ۔

اعظم اثر اپنے علاقے کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ انھوں نے غزل، پابند نظم، آزاد نظم، قطعہ، حمد، نعت اور منقبت ثلاثی، ماہیا اور ہائیکو جیسی مختلف النوع اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ اعظم اثر نے سنجیدہ شاعری کے علاوہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی کی ہے۔ ''اجالے تبسم کے'' ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ اعظم اثر کو جہاں غزل کہنے کا ملکہ تھا وہیں انھیں نظم نگاری پر بھی قدرت حاصل تھی۔ پیشِ نظر مضمون میں ان کی نظم نگاری کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔

اعظم اثر کے ذخیرۂ کلام کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پابند نظمیں بھی کہی ہیں اور آزاد نظمیں بھی۔ ان کے پہلے مجموعے ''زخمِ آ گہی'' میں چھ پابند نظمیں ہیں۔ یہ تمام نظمیں ایسی ہیں جن پر ترقی پسندی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مفہوم، پیغام اور ڈکشن کے اعتبار سے یہ نظمیں اعظم اثر کو ترقی پسندوں کی صف میں کھڑا کرتی ہیں۔ نظموں کی ہیئت انھیں ساحر لدھیانوی کے قریب کرتی ہے۔ یہ نظمیں پڑھتے وقت ساحر کی نظموں کا اسلوب یاد آتا ہے۔ دو نظمیں ''تاریکی'' اور ''یاس'' کو چھوڑ کر باقی چاروں نظمیں ایسی ہیں جن کے ہر بند میں چار چار مصرعے ہیں۔ ہر بند اپنی جگہ ایک مستقل قطعے کی خصوصیت کا حامل ہے جو ساحر کی نظموں کا مخصوص انداز ہے۔

اعظم اثر نے جب شاعری شروع کی تو اگر چہ اس وقت ترقی پسندی کا غلغلہ ختم ہو گیا تھا اور اس پر زوال کے آثار نمایاں تھے لیکن ان کے سامنے ترقی پسند شاعری کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اعظم اثر کے مزاج میں بھی انقلاب پسندی، دل میں نئے سماج کی تعمیر کی خواہش، ذہن میں مثبت تبدیلی کی سوچ اور آنکھوں میں

امن ومساوات کا خواب تھا۔اسی لیے ان کے اس دور کی غزلوں خصوصاً نظموں میں یہ اندازِ نظر زیادہ نمایاں ہے۔مثلاً نظم ''ارادہ'' سے ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

ہم اپنے حوصلوں سے آج تقدیریں بدل دیں گے
جبینِ غم کی خوں آشام تحریریں بدل دیں گے
جہاں انسان کو انسان بھی سمجھا نہیں جاتا
نظامِ زر پرستی کی وہ تعزیریں بدل دیں گے
(زخمِ آگہی،ص:74)

یہ نظم انقلابی لہجے کی حامل اور کچھ کرگزرنے کے جذبات سے معمور ہے۔'' نغمۂ نو'' بھی کم وبیش ایسے ہی جذبات واحساسات کی حامل متاثر کن نظم ہے۔اس نظم میں نئے دور(غالباً آزادی کی طرف اشارہ ہے) کا استقبال کرتے ہوئے مذہبی تاجروں ،جنگ بازوں، اجنبی حکمرانوں (انگریز)انسان اورانسان کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے والوں کی شکست اور انسانیت ومحبت کی جیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔''اہلِ زر'' کے استحصالی رویے کے پیشِ نظر یہ کہا گیا ہے کہ انھیں ابھرنے کا موقع نہ دیں ورنہ بقول شاعر:

اہلِ زر جو پھر اک بار ابھریں
ارتقا کا چلن بیچ دیں گے
اقتدارِ گلستاں جو پالیں
تو یہ سارا چمن بیچ دیں گے

اس طرح شاعر نے سرمایہ داری کی مذمت کی ہے۔نظم کے آخر میں کہا ہے:

بھوک کی آگ میں تپنے والے
زرد چہرے نکھرنے لگے ہیں
مرحبا اے نگارِ تمنا
تیرے گیسو سنورنے لگے ہیں

نظم ''انسانیت'' میں ذات پات اور مذہب وملت سے اوپر اٹھ کر انسانیت سے پیار کرنے اورانسانیت کوفروغ دینے کی بات کہی گئی ہے۔اعظم اثر کواس بات کا دکھ ہے کہ اہلِ ملک فرقہ وارانہ یکجہتی کوفروغ دینے کی بجائے فرقہ وارانہ کشیدگی کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔اس پر طرفہ تماشا یہ کہ نام نہاد''رہبرانِ قوم'' دونوں فرقوں میں عدوات اور نفاق کے بیج بو رہے ہیں۔اس تناظر میں کہے گئے دو بند ملاحظہ کریں:

کون انسانیت کا شیدا ہے
کس میں جرأت ہے کون انساں ہے
ہم وہاں ہیں جہاں ابھی اے دوست
کوئی ہندو،کوئی مسلماں ہے
رہبروں نے تو رحم فرما کر
رہزنی اور گمرہی دی ہے
ان رحیم اوررام والوں نے
صرف آپس کی دشمنی دی ہے

نظم ''اشتراکی''،میں تواعظم اثر خالص اشتراکی دکھائی دیتے ہیں۔دلیل کے طور پر یہ اشعار دیکھیں:

واقفِ رازِ غمِ گردشِ ایام ہوں میں
ظلم اور جور کے آغاز کا انجام ہوں میں
ذوقِ آزادیِ انساں کا نیا نام ہوں میں
عہدِ حاضر کے لیے عیش کا پیغام ہوں میں

پنڈت اور پارسا وشیخ سے بہتر ہوں میں
حسن والے بھی سمجھتے ہیں کہ دلبر ہوں میں
انقلاباتِ مسرت کا پیمبر ہوں میں
اشتراکی ہوں نئے دور کا رہبر ہوں میں

اعظم اثر کے دوسرے مجموعے ''متاعِ آ گہی'' میں سولہ نظمیں ہیں اور سب کی سب آزاد فارم میں ہیں۔ان نظموں کا لہجہ اور ڈکشن پہلے مجموعے کی نظموں سے بالکل الگ ہے۔یہ نظمیں موضوعات، مضامین اور اسلوب کے اعتبار سے جدید طرزِ اظہار کی حامل ہیں۔ان نظموں کے مطالعے سے گمان ہوتا ہے کہ اس دور میں اعظم اثر جدیدیت سے کچھ کچھ متاثر رہے ہیں۔مثال کے طور پر دو چھوٹی نظمیں ملاحظہ فرمائیں:

عمر رسیدہ

ستر سال پرانا کاغذ/روز و شب/
برسات میں غم کی/بھیگ رہا ہے
بھیگتے بھیگتے اس حالت میں/
پہنچا ہے کہ/ پھٹ جائے گا

یاد کا سورج

دیا کمرے کا میرے/بجھ گیا تھا/
کہ اس میں تیل ہی باقی نہیں تھا
مسلط ہو چکی تھی/سارے کمرے میں/بھیانک تیرگی بھی
اور اداسی بھی/یکا یک/
اک نیا منظر ابھر آیا نیا اک در کھلا جس سے
تمھاری یاد کا سورج ابھر کر/
مرے کمرے کو/روشن کر رہا تھا

یہ تمام نظمیں مختصر اور متاثر کن ہیں۔ تیسرے مجموعے ''رشتوں کا درد'' میں پابند اور آزاد دونوں قسم کی نظمیں ہیں۔پابند نظموں کا انداز بیانیہ ہے جب کہ آزاد نظمیں اشاراتی اور استعاراتی اسلوب کی حامل ہیں۔''تصویرِ درد'' ستائیس اشعار پر مشتمل چھوٹی بحر میں کہی گئی نظم ہے۔ اس میں اعظم اثر نے ''درد'' کی شاعرانہ تعریف وتعبیر اور توضیح وتشریح کی ہے۔نظم کے ابتدائی دو تین شعر دیکھیں:

درد ہر اہلِ دل کی دولت ہے
درد ہے پیار، درد الفت ہے
درد اک دل نواز عبادت ہے
درد دنیا میں ایک جنت ہے
درد اللہ کی امانت ہے
درد انسان کی ضرورت ہے

راقم الحروف کا خیال ہے کہ نظم کا عنوان ''تصویرِ درد'' نہیں بلکہ ''تعبیرِ درد'' ہوتا تو بہتر تھا۔اس لیے نہیں کہ اس عنوان کی حامل اقبال کی مشہور نظم ہے بلکہ اس لیے کہ اس نظم میں 'درد' کی تصویر کشی نہیں ہے بلکہ اس کی شاعرانہ تشریح وتعبیر پیش کی گئی ہے۔

نظم ''اردو'' میں اردو زبان کی خصوصیت اور انفرادیت کو واضح کرتے ہوئے اس کی سخت جانی کا اعتراف کیا گیا ہے۔اس نظم سے شاعر کی اپنی زبان سے اٹوٹ محبت ظاہر ہوتی ہے جو ہونی بھی چاہیے۔''رودادِ غم'' متاثر کرنے والی حزنیہ نظم ہے۔اس نظم میں شاعر نے اپنے شخصی غم واندوہ، محرومیوں اور زخموں کا رونا رویا ہے۔نظم کے پہلے شعر ہی سے حزنیہ رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ملاحظہ کریں:

> ”اعظم اثر کے ذخیرۂ کلام کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پابند نظمیں بھی کہی ہیں اور آزاد نظمیں بھی۔ان کے پہلے مجموعے ''زخمِ آ گہی'' میں چھ پابند نظمیں ہیں۔یہ تمام نظمیں ایسی ہیں جن پر ترقی پسندی کی چھاپ نظر آتی ہے“

غموں کی ہے یلغار دل پر مرے، دکھوں کا ہے یہ سلسلہ دیر سے
مری راہ رو کے تھا میرا لہو، میں خود سے بھی آ کر ملا دیر سے

''سوچ کا سایہ'' آزاد نظم ہے جس میں اداسی اور محرومی کی

کیفیت پوشیدہ ہے۔نظم میں شاعر نے اس تمنا کا اظہار کیا ہے کہ بڑھاپے اور ضعیف العمری میں اسے سوکھے پیڑ کی طرح نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ اسے سایہ دار شجر گردانتے ہوئے اس سے فیض اٹھایا جائے۔نظم میں ایک درد اور کسک پوشیدہ ہے۔آج کل یہ بات مشاہدے میں آرہی ہے کہ باپ کے بوڑھے ہوجانے کے بعد اس کے بچے اس کے تجربات سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے اسے از کار رفتہ سمجھ کر بری طرح نظر انداز کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں باپ کے دل پر کیا بیتتی ہوگی یہ وہی جانتا ہے۔ بوڑھے باپ کے اسی احساس کا اظہار اس نظم میں ہوا ہے۔اس مجموعے کی بیشتر نظمیں چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن فکر انگیز اور متاثر کرنے والی ہیں۔مثال کے طور پر دو نظمیں دیکھیں:

حالات کا مقتل

حالات کے/مقتل میں کھڑا
سوچ رہا ہوں/کیا
سارے اجالوں کا یہاں
قتل ہوا ہے

مشاہدہ

کوئی الجھن/
نہیں پایا جنوں کی موجوں سے
خرد کے/سارے سفینے کھڑے ہیں/ساحل پر

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعظم اثر کو جہاں غزل کہنے پر قدرت حاصل تھی وہیں انھیں نظم کہنے کا ملکہ بھی حاصل تھا۔انھوں نے بیانیہ اور استعاراتی دونوں قسم کی نظمیں کہی ہیں لیکن ان کی بیانیہ اور پابند نظمیں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔

❖❖❖

Professor Maqbool Ahmed Maqbool
Dept.of Urdu Maharshtra Udayagiri College
UDGIR-413517, Dist.Latur **(M.S)**
Mob: 9028598414

غزل

ہم کو محفل کی آبرو کہیے
جب بھی کہیے تو ماہ رو کہیے

بات ہوتی ہے جو بھی آپس میں
اس کو اس دل کی گفتگو کہیے

ماہی آب میں تڑپ ہے جو
آب کی اس کو جستجو کہیے

کتنی سندر صنم کی آنکھیں ہیں
جام کہیے انھیں سبو کہیے

ہر دعا میں اسے ہی مانگا ہے
بس یہ یسریٰ کی آرزو کہیے

یسریٰ راحت

Yusra Rahat
C/o Rahat Husain Abbasi,
H.N.11, Ghati Bharbhuja near
Chahak hospital,
Bhopal,M.P-462001
Mob.7554224336

ڈاکٹر محبوب حسن

گورکھپور

مرلی دھر طالبؔ کی غزلیہ شاعری

شاعری کو بجا طور پر انسانی جذبات واحساسات کے اظہار کا خوبصورت وسیلہ تصور کیا جاتا ہے۔اردو میں شعروشاعری کا نہایت توانا اور مستحکم سلسلہ موجود ہے۔خسروؔ، ولیؔ، میرؔ، دردؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ جیسے شاعروں نے اردو میں شعری روایت کو مالا مال کیا۔ان کلاسیکی فنکاروں نے اردو شاعری کو فکروفن کی نت نئی منزلوں سے ہم کنار کیا۔ہر دور کے شاعروں اور ادیبوں نے اردو شاعری کی رگوں میں تخلیقیت کا تازہ لہو دوڑایا۔خاص طور پر میرؔ اور غالبؔ کے دور میں اردو شاعری فکروفن کی نئی بلندیوں سے دو چار ہوئی۔ یوں تو اردو میں غزل، نظم، مرثیہ، قصیدہ جیسی بہت سی اہم شعری اصناف موجود ہیں لیکن صنف غزل اپنی بعض منفرد خوبیوں کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔اردو غزل کو بجا طور پر اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے۔ ہر زمانے کے چھوٹے بڑے شاعروں نے صنف غزل میں اپنے تخلیقی کمالات کا اظہار کیا ہے۔ قدیم زمانے سے ہی غزل پر بہت سارے الزامات عائد کیے گئے لیکن یہ صنف شاعری اپنا سفر بتدریج اور خوش اسلوبی سے طے کرتی رہی۔ درحقیقت صنف غزل میں ہر زمانے کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔

اردو غزل نے مختلف ادوار میں اپنے لیے فکروفن کے نئے نئے تخلیقی سانچے تیار کرتی رہی۔کلاسیکی دور سے لے کر ترقی پسند تحریک اور پھر عصر حاضر تک اس نے مختلف رنگ وروپ تبدیل کیے۔ذہن نشیں رہے کہ یہ تبدیلی فن اور فکر دونوں سطحوں پر تھی۔لفظیات ،تراکیب، پیکر تراشی، رمزیت اور علامتی اور استعاراتی پیرایۂ اظہار نے جدید اردو غزل کو نئے تجربات ومشاہدات سے آشنا کیا۔جدید غزل گو شاعروں نے روایت کے برعکس نئی لفظیات وتراکیب اور نئے تشبیہات واستعارات وضع کیے۔گل وبلبل، صید وصیاد، جام وسبو، سروقمری اور بت وصنم جیسے استعارات رفتہ رفتہ جدید اردو غزل سے معدوم ہوتے گئے اور ان کی جگہ خدا، پانی، بنجر، ریت، سایہ، گھر، سمندر، جزیرہ، درخت، مکان، ندی، آسمان، بستی، دیوار، بارش، سورج، آئینہ، صبح، دوپہر اور رات جیسی علامتوں نے لے لی۔ جدید اردو غزل میں نئے تصورات وروایات کی نمائندگی کرنے والے شعراء کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔غزل کے ان جدید رجحانات ومیلانات کو تخلیقی پیکر عطا کرنے والے شعراء میں ناصر کاظمی، شہریار، ظفر اقبال، محمد علوی، عادل منصوری، پروین شاکر، منیر نیازی، مظہر امام، افتخار عارف، عرفان صدیقی، حسن نعیم، خلیل الرحمان

اعظمی، وحید اختر، شکیب جلالی، احمد مشتاق، باقر مہدی اور صدیق مجیبی وغیرہ کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ان قلم کاروں نے انسان کی خارجی زندگی کی بہ نسبت داخلی و باطنی کیفیات پر اپنی خاص توجہ مرکوز کی۔

عہد حاضر میں اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کے گیسو سنوارنے والوں میں مرلی دھر طالبؔ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔وہ گزشتہ کئی برسوں سے اردو شاعری میں اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔اردو غزل ان کی محبوب ترین صنف سخن ہے۔ان کی تخلیقات ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں تواتر کے ساتھ اشاعت پذیر ہوتی رہی ہیں۔''حاصل صحرانوردی'' کے عنوان سے ان کا ایک شعری مجموعہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔طالبؔ کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ایک نوع کی آہستہ روی موجود ہے۔وہ زبردستی شعر نہیں کہتے بلکہ جذبات اور احساسات کے بہہ نکلنے کا انتظار کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں آورد کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ان کی غزلوں کا رنگ جداگانہ ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی کی بیش بہا قدروں کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔طالبؔ کی تخلیقات میں فکر و فن کا اکہرا پن نظر نہیں آتا۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ مرلی دھر طالبؔ پیشے سے ایک پولس افسر ہیں۔ان کا تعلق ملک کی معروف دانش گاہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی سے رہا ہے، جہاں سے ان کا ادبی ذوق پروان چڑھا۔انھیں اردو زبان و ادب سے بے طرح محبت رہی ہے۔مرلی دھر طالبؔ جیسی شخصیت کا اردو زبان و ادب سے وابستہ ہونا اردو کے لیے نیک فال ہے۔ایسی ادبی شخصیت کی تخلیقی خدمات کا اعتراف کھلے دل سے کیا جانا چاہیے۔موصوف نے اردو کے تعلق سے اپنی والہانہ رغبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اردو زبان سے رغبت اور محبت مجھے عہد طفلی ہی سے تھی۔اپنے قرب و جوار کے علاقے میں بزرگوں اور مہاجر ہندوؤں کو اردو اخبارات پڑھتے دیکھا کرتا اور زبان سنتا۔اس طرح اردو کی شیرینی کا رس میرے کانوں میں گھلتا گیا۔اس زبان کی خوشبو سے میرے دل و دماغ معطر ہونے لگے۔پھر اس زبان کے لیے میرے اندر بہت زیادہ انسیت اور امنگیں پیدا ہو گئیں۔اس لشکری ریختہ کی مٹھاس اور چاشنی نے مجھے اپنا عاشق بنا لیا۔یہ اردو کی جادوگری نہیں ہے تو اور کیا ہے۔''

(حاصل صحرانوردی، مرلی دھر طالبؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۷، ص:۱۲)

مرلی دھر طالبؔ زندگی کے شاعر ہیں۔ان کے یہاں زندگی کا ہر رنگ موجود ہیں۔ان کی شاعری زندگی کی مثبت قدروں کا پیغام دیتی ہے۔ان کی غزلیں بعض اوقات مسرت کے ساتھ ساتھ غم کی کیفیت سے بھی آشنا کرتی ہے کیوں کہ انسانی زندگی صرف خوشی اور مسرت کا نام نہیں ہے۔بلکہ اس میں غم اور اداسی کی کیفیت بھی فطری طور پر شامل ہے۔لیکن یہ غم ہمیں زندگی سے فرار اختیار کرنے یا ٹوٹ کر بکھر جانے کی تعلیم نہیں دیتا۔خوشی اور غم کی یہی کیفیت قاری کو زندگی کی جمالیاتی قدروں اور فلسفیانہ احساس سے ہم کنار کرتی ہے۔طالبؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف انسانی زندگی کی فلسفیانہ صداقتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ انہیں تنہائیوں میں بھی مسکرانے کا فن آتا ہے۔ان کی شاعری میں انسانی تمناؤں ، آرزؤں اور خوابوں کی حسین دنیا آباد ہے۔ان کے یہاں سب

کچھ پالینے کا احساس ہے تو کچھ کھو دینے کا ملال بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ناامیدی کا گزر نہیں۔انھیں باطنی احساسات اور داخلی کیفیات کو شعری سانچوں میں ڈھالنے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ گٹھری زندگانی کی کبھی بھاری نہیں لگتی
ہے تیرا ساتھ تو آندھی مجھے آندھی نہیں لگتی
سفینے کو ملے ساحل مجھے تم مل گئے ہو جب
تمنا زندگی میں اب کوئی باقی نہیں لگتی
بدن کا برہنہ حصہ وہ ڈھک دیتی ہے الفت سے
میری چادر بہت چھوٹی ہے پر چھوٹی نہیں لگتی

درج بالا اشعار کی روشنی میں مرلی دھر طالبؔ کی شاعرانہ انفرادیت اور تخلیقی جدت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اچھے شعر کی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ دل سے نکلے اور دل میں جا بیٹھے۔یعنی قاری کو یہ محسوس ہو کہ شاعر نے اس کے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔طالبؔ نے اپنی شاعری میں اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کو خلاقانہ انداز میں آپ بیتی بنا کر پیش کیا ہے اور یہی آپ بیتی جگ بیتی کا روپ دھار لیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں عوام وخواص دونوں طبقوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔دراصل ان کی شاعری آپ بیتی سے جگ بیتی کا ایک ایسا خوبصورت سفر ہے، جہاں زندگی کا ہر رنگ موجود ہے۔ جہاں خوشی بھی ہے، غم بھی ہے، ہجر بھی ہے، وصال بھی ہے، دھوپ بھی ہے، چھاؤں بھی ہے۔ان کی غزلیں غیر منطقی استعاروں اور پیچیدہ علامتوں سے پاک ہیں۔دراصل طالبؔ نے عام فہم اور فطری کیفیات سے اپنا شعری محاورہ خلق کیا ہے ۔موصوف کسی بھی قسم کی جدت پسندی کے لیے اپنی شاعری کو اندھیروں میں بھٹکنے کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ صحت مند شعری اقدار اور روایات کو مقدم سمجھتے ہیں۔ان کے اشعار میں زندگی اپنے فطری لوازمات کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔اسی لیے ان کے فن پاروں کی سادگی اور سلاست میں بھی فطری حسن کا جوہر موجود ہے۔بطور مثال اشعار پیش خدمت ہیں:

بن کے قطرہ رہا سدا مجھ میں
اک سمندر جو تھا چھپا مجھ میں
تھرتھرانے لگا ہوں جھیل سا میں
آ کے پتھر ابھی گرا مجھ میں

رومانی فکر واحساس حیات وکائنات کا ناگزیر حصہ ہے۔ اس سے انسانی زندگی نمو پاتی ہے۔اس کے بغیر زیست کا تصور ممکن نہیں۔ یہ احساس کبھی عشق حقیقی تو کبھی عشق مجازی کی شکل میں ہمارے وجود کی تکمیل کرتا ہے۔ ہر عہد کے ادیبوں اور شاعروں نے رومانوی فکر وخیال کو اپنی تخلیقات میں شعوری اور غیر شعوری طور پر پیش کیا ہے۔خسروؔ، ولیؔ، میرؔ، دردؔ، ناسخؔ، آتشؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ وغیرہ نے عشقیہ مضامین کو نظرانداز نہیں کیا۔ رومانی موضوعات کی پیشکش میں سبھی کا اپنا منفرد انداز اور جداگانہ رنگ و آہنگ ہے۔کہیں محبوب سے روحانی عقیدت مندی کا احساس ہے تو کہیں رومانیت کا مجازی تصور ابھرتا ہے۔ مرلی دھر طالبؔ کی شاعری میں بھی عشق ومحبت کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔انھوں نے رومانی موضوعات کی پیش کش میں جذباتیت سے اپنا دامن بچایا ہے۔ان کی شاعری میں خیال کی پاکیزگی اور جذبے کی صداقت آشکارا ہے۔اس حوالے ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے عشق تیرے غم میں تو بیمار ہم نہیں
ہر در پہ گر پڑے جو وہ کردار ہم نہیں
حسن کے جب ہاتھ پیلے ہو گئے

میل کے پتھر نکیلے ہو گئے

زرد چہرہ ہو گیا ہے عشق کا
چلتے چلتے پاؤں نیلے ہو گئے

اس کی آنکھوں سے نظر ہٹتی نہیں
خواب بھی کتنے نشیلے ہو گئے

اس قدر خود ہی میں سمٹا ہوں کہ بس
سارے کپڑے خود ہی ڈھیلے ہو گئے

اردو شاعری میں فکر وفن کی بحث کافی پرانی ہے۔اس تعلق سے ہر شاعر اور ادیب کا اپنا ذاتی موقف اور نظریہ ہے۔بعض ادیب فکر وموضوعات کو کلیدی اہمیت دیتے ہیں تو بعض فن اور تکنیک کو بنیادی ضرورت تصور کرتے ہیں۔یہ نظریاتی اختلاف ادب کے لیے بے حد ضروری ہے۔کیوں کہ ادب سائنس کا فارمولہ نہیں ہوسکتا ہے۔اسے کھلی فضاؤں میں سانس لینے کی آزادی ہونی چاہیے۔یہ آزادی شعروادب میں فکری تازگی پیدا کرتی ہے۔دراصل کسی قسم کی ازم یا ادعائیت شعروادب کو مخصوص فکری دائرے میں محدود کردیتی ہے۔ایک ادیب اور شاعر کو اس بات کی پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے فن پارہ تخلیق کرسکے۔قابل غور ہے کہ ہمارے یہاں ترقی پسندی اور جدیدیت نے اردو ادب کو خاطر خواہ انداز میں مستحکم کیا لیکن ان کی نظریاتی انتہا پسندی سے ادب کو نقصان بھی پہنچا۔جدیدیت کے نام پر اردو شاعری اور فکشن میں نئے نئے تجربات کیے گئے اور آج بھی کیے جارہے ہیں۔ان تجربات سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اردو ادب سے عوام کا رشتہ کم وبیش ٹوٹ گیا تھا اور اردو کا عام قاری اجنبیت کا احساس کرنے لگا تھا۔قابل غور ہے کہ یہ صورت حال ایک طویل عرصے تک چھائی رہی لیکن وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ اس مخصوص تخلیقی روش سے اردو ادب آزاد ہوا۔مرلی دھر طالبؔ کا تعلق شاعروں کے اس جماعت سے ہے جن کی شاعری عوام وخواص دونوں حلقوں میں یکساں طور پر مقبول رہی ہے۔طالبؔ کی شاعری عام قاری کے لیے روشنی کا سفر ہے۔وہاں اسے اپنی زندگی کا عکس محسوس ہوتا ہے۔طالبؔ کی شاعری میں فکری بصیرت کے ساتھ ساتھ تخلیقی اظہار کی قوت بھی موجود ہے۔انہیں ماضی ، مستقبل کے قدم بہ قدم عصری زندگی کے فلسفیانہ تقاضوں کا بھی احساس ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لوگ اب آگے نکلنے لگ گئے
ہم ذرا کیا دھیرے چلنے لگ گئے

آج کا انسان پتھر ہو گیا
پتھروں کے دل پگھلنے لگ گئے

مرلی دھر طالبؔ کی غزلیں حیات وکائنات کے بعض اہم نکات کو خوبصورتی سے آشکار کرتی ہیں۔ان کی شاعری میں جلال اور جمال دونوں کیفیتیں نظر آتی ہیں۔طالبؔ کی شاعری اپنی تخلیقی توانائی اور فکری بصیرت کے سبب ہمارے خوابیدہ احساسات اور جذبات کو انگیز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔انھوں نے اپنے تخلیقی دائرے کو اپنی زندگی کے گہرے تجربات ومشاہدات کی بنا پر وسیع تر کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فکر کی سطح پر تنگ دامانی کا احساس نہیں ہوتا۔امید ہے کہ مرلی دھر طالبؔ کی شاعری اپنے تخلیقی امتیازات کے سبب قارئین کے درمیان تادیر زندہ رہے گی اور ان کی تخلیقی کائنات پر گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔

❖❖❖

Dr Mahboob Hasan
Asst. Professor
Department of Urdu, DDU University,
Gorakhpur (UP،) Pin-273009
Mobile: 8527818385

غزل

سوچتا ہوں کہ ترے عشق کا اقرار کروں
تیری آنکھوں میں اتر جاؤں تجھے پیار کروں

حل کرے کون، یہاں کوئی بھی فرصت میں نہیں
مسئلے دل کے چھپاؤں کہ آشکار کروں

کیوں نہ اٹھ جائے یہ پردہ ترے چہرے سے ابھی
ایک مدت سے تمنا ہے کہ دیدار کروں

ہے سنا پھول محبت کے کھلے ہیں اس میں
باغِ اردو کی طرف کیوں نہ رہ گزار کروں

جانتا ہوں کہ ترے حسن میں ہے اک جادو
سوچنا کیا ہے کہ میں کیسے دل نثار کروں

صرف محسوس ہی کرنا تو نہیں ہے تجھ کو
خواب سے آؤں جو باہر تو میں اظہار کروں

صدام غنی

Saddam Ghani
HN-13, Cross Road-3,
Azad Nagar, Mango,
Jamshed Pur-831012 (Jharkhand)
Mob.9631832842

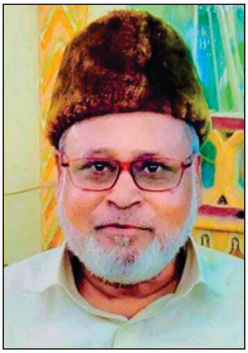

غزل

بخش کر ذہنِ رسا اور دلِ بیدار مجھے
اُس نے پھر سونپ دیا شہرِ سخن زار مجھے

کیوں نہ حیرت سے تکے چشمِ خریدار مجھے
کھینچ لائی ہے ضرورت سرِ بازار مجھے

سر قلم ہو گیا دستار بچانے میں مرا
تھی عزیز اتنی کبھی حرمتِ دستار مجھے

دولت علم و ہنر سے تو سر افراز کیا
نہ دیے اُس نے اگر درہم و دینار مجھے

میرے حصے میں زمیں آئے گی دو گز اک دن
وقت اس طرح بنا دے گا زمیندار مجھے

فن کی حرمت پہ کبھی حرف نہ آنے دوں گا
لاکھ تسلیم نہ دنیا کرے فنکار مجھے

صرف مخمورؔ تخلص کا خطاوار ہوں میں
لوگ بے وجہ سمجھ لیتے ہیں میخوار مجھے

ڈاکٹر مخمورؔ کاکوروی

Dr. Makhmoor Kakorvi
68. Chaudhry Mohalla,
P.O.KAKORI-226101,Lucknow
Mob.9450097929

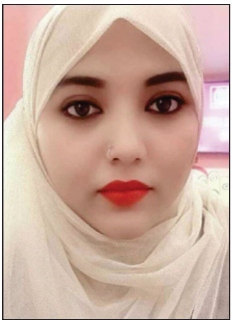

سعدیہ صدف

ریسرچ اسکالر، کولکاتہ

سدا بہار نغمہ نگار: آنند بخشی

کہتے ہیں کہ موسیقی بذات خود عالمی زبان ہے جس کی مفاہمت لفظوں کی ضرورت سے ماورا ہے۔ کرۂ ارض پر تمام ثقافتوں اور معاشروں کے مابین موسیقی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ زبان و بیان سے پرے موسیقی کی ہر دھن اور ہر لے انسانی جذبات کو انگیخت کرنے اور اس کے زخموں کو مندمل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مثلاً شکیرا کے نغمے ہوں یا برٹنی اسپیرس کے، ساؤتھ سنگر اور اداکار دھنش کا مشہور زمانہ نغمہ کولاویری ڈی (why this kolaverri di) ہو یا پھر کیفی خلیل کا نغمہ کہانی سنو، ان سب میں مشترک عنصر موسیقی ہے جس نے زبان و بیان کی قید سے پرے انسانی جذبات کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ تاہم اگر زبان کا علم ہو اور نغمے کی تفہیم ہو جائے تو نغمے اور موسیقی مل کر سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہیں۔ یعنی ایسے نغمے جو عام انسانی زندگی اور جذبات کے عکاس ہوں، ایسے نغمے جو ہر فرد کے لئے ہوں۔ جن کی ترسیل میں کوئی رخنہ نہ ہو۔ ایسے ہی نغمے سدا بہار اور یادگار ہو جاتے ہیں۔ ہندی فلمی دنیا کو ایسے ہی نغموں سے مالا مال کرنے والے شاعر کو ہم آنند بخشی کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جن کی ولادت ۲۱/جولائی ۱۹۳۰ء کو برطانوی بھارت کے شہر راولپنڈی میں ہوئی تھی۔ ان کا اصل نام آنند پرکاش بخشی تھا لیکن فلمی دنیا میں بطور آنند بخشی مشہور ہوئے۔ ان کے رشتہ دار پیار سے انہیں نند یا نندو بھی کہا کرتے تھے۔ تقریباً سترہ سال راولپنڈی میں گزارنے کے بعد آنند بخشی نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔

آنند بخشی کا بچپن عسرت زدہ ماحول میں گزرا۔ سات سال کی عمر میں وہ والدہ کے شفیق سائے سے محروم ہو گئے۔ کم عمری کا یہ زمانہ والدین کی توجہ، ان کی محبت و شفقت کا طلبگار ہوا کرتا ہے، لہٰذا ان کی عدم موجودگی میں نندو کا دل پڑھائی لکھائی سے اچاٹ ہونے لگا۔ بالآخر آٹھویں جماعت میں انھوں نے اسکول کو خیرباد کہا اور رائل نیوی میں داخل ہو گئے۔ کیونکہ چھوٹو ہار علاقے کے اکثر افراد فوج سے وابستہ ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا آنند بخشی نے بھی اس روایت کی پاسداری کی۔ کچھ عرصے بعد اس نوکری سے فراغت اختیار کی اور بری فوج میں شمولیت اختیار کی۔ یوں زندگی گزرتی رہی۔ لیکن بخشی کے خواب کچھ اور تھے اور قسمت کو بھی کچھ اور ہی منظور تھا۔

بخشی کو گلوکاری کا شوق تھا۔ وہ جب بھی فلمیں دیکھ کر لوٹتے تو موقعے کی مناسبت سے نئے نغمے تخلیق کرتے اور انہیں خود گاتے۔ گلوکاری اور نغمہ نگاری کے اسی شوق نے انہیں ممبئی کی راہ

دکھائی۔ ۲؍اکتوبر ۱۹۵۶ء کو وہ ساٹھ گیتوں کے ساتھ ممبئی پہنچے لیکن زندگی اتنی آسان نہیں تھی کہ قسمت کی باریابی فوراً ہو جاتی۔ ممبئی میں انھوں نے کافی جدو جہد کی۔ یہاں انہوں نے بطور موٹر مکینک اور ٹیلی فون آپریٹر کے کام کیا اور اپنے شوق کی تکمیل کے لیے بھی کوشاں رہے۔ ممبئی کے اسٹیشنوں، مرین ڈرائیو اور چوپاٹی ایسے مقامات تھے جہاں بیٹھ کر انھوں نے نہ جانے کتنے ہی گیت لکھ ڈالے۔ جب ممبئی میں ان کا گزارا مشکل ہونے لگا تو مجبوراً انہوں نے واپس لوٹنے اور فوج میں دوبارہ داخلے کا ارادہ کیا۔ بس اس ارادے سے اسٹیشن پر اپنی گاڑی کے منتظر ہی تھے کہ ان کی ملاقات چترامل نامی ایک ٹکٹ کلکٹر سے ہوئی۔ ان سے گفتگو کے دوران آنند بخشی نے اپنے خوابوں اور ارمانوں کی ساری گٹھری کھول کر رکھ دی۔ چترامل نے بخشی کے اندر گلوکاری اور گیتوں کے تئیں موجود شدت کو محسوس کرتے ہوئے انہیں حوصلہ دیا اور سہارا دینے کا فیصلہ کیا۔ لمحے بھر میں آنند بخشی کو ایسا اطمینان مل گیا گویا ڈوبتے کو تن کے کا سہارا مل گیا ہو۔

موسیقی کے تئیں بخشی کا یہی جنون ان کے تکمیل شوق کے لئے بارآور ثابت ہوا۔ کافی عرصے تک فلم انڈسٹری میں جدو جہد کرنے کے بعد بالآخر انہیں موقع مل ہی گیا۔ ۱۹۵۸ء میں برج موہن کی فلم ''بھلا آدمی'' کے لئے انہیں چار گانے لکھنے کا موقع ملا۔ ان کا پہلا گانا ''او دھرتی کے لال'' تھا جسے ان کی آواز میں ریکارڈ بھی کیا گیا تھا۔ اس طرح فلمی دنیا میں ان کی entry ہوگئی۔ ۱۹۶۲ء میں فلم ''مہندی لگی میرے ہاتھ میں'' میں بھی انہیں نغمہ نگاری کا موقع ملا۔ لیکن ان کی شناخت ۱۹۶۵ء میں بنی فلم ''جب جب پھول کھلے'' سے قائم ہوئی۔ اس فلم کے سارے نغمے ''پردیسیوں سے نہ اکھیاں ملانا''، ''یہ سماں سماں ہے یہ پیار کا''، ''ایک تھا گل اور ایک تھی بلبل'' مقبول عام ہوئے اور راتوں رات انہیں شہرت کی بلندیوں پر فائز کر دیا۔ اسی سال انہوں نے فلم ''ہمالیہ کی گود میں'' کے لئے نغمہ ''چاند سی محبوبہ ہو مری'' لکھا۔ اسے بھی شائقین نے بہت سراہا۔ ۱۹۷۲ء میں انہوں نے فلم ''موم کی گڑیا'' کے لیے نغمہ نگاری و گلوکاری دونوں کی۔ یوں ان کی گلوکاری اور نغمہ نگاری کا خواب پایہ تکمیل کو پہنچا۔ یہ اور بات ہے کہ بطور نغمہ نگار ہی انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ اپنے فلمی کریئر کے دوران آنند بخشی نے کل ۶۵۰؍فلموں کے لئے ۳۵۰۰؍نغمے لکھے۔ چالیس دفعہ ان کے نغمے فلم فیئر اعزاز کے لئے نامزد ہوئے۔ اور چار دفعہ انہیں یہ اعزاز ملا۔ مثلاً:

۱۔ ''آدمی مسافر ہے'' (فلم: اپنا پن۔ ۱۹۷۷ء)

۲۔ ''تیرے میرے بیچ میں کیسا ہے''
(فلم: اک دوجے کے لیے۔ ۱۹۸۱ء)

۳: ''تجھے دیکھا تو یہ جانا صنم''
(فلم: دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔ ۱۹۹۵ء)

۴: ''عشق بنا کیا جینا'' (فلم: تال۔ ۱۹۹۹ء)

آنند بخشی ایک حساس فنکار تھے۔ ان کے افکار و خیالات زمینی تھے۔ انھوں نے زمین سے اپنے رشتے کو برقرار رکھتے ہوئے احساسات کا بیان فطری اور تازہ دم رکھا۔ ''عام آدمی'' سے ان کے اسی ربط نے انہیں اپنے معاصرین ساحر لدھیانوی، گلزار اور مجروح سلطان پوری کے مقابلے زیادہ ''عوامی'' بنائے رکھا۔ کیونکہ ان شعراء کے کارنامے فن کی اعلیٰ مثال سمجھے گئے اور اس کا احساس آنند بخشی کو بھی خوب خوب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ خود کو ''فلمی نغمہ نگار'' ہی کہا، اور شاعر کہلانے سے گریز کیا۔

آنند بخشی نے اپنے چالیس سالہ کریئر میں موسیقاروں کی کئی جنریشن کے ساتھ کام کیا۔ جہاں دوسرے نغمہ نگار ۸؍دنوں

میں گانے لکھتے وہاں بخشی کو محض ۸؍منٹ لگتے۔انھیں اپنے نغموں کی بے پناہ مقبولیت کا احساس اس وقت ہوا جب انھوں نے ٹرین کے سفر میں، دوردراز گاؤں کے ایک سائل سے اپنے گانے سنے۔اس واقعے کو انھوں نے انو کپور کے ریڈیو شو''سہانا سفر'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

''جب میں نے اپنا گانا ایک ایسے بھکاری کو گاتے ہوئے سنا جس کے پاس ریڈیو تک نہیں، ایک ایسے گاؤں میں جس میں بجلی بھی نہیں ہے، مجھے احساس ہوا کہ میرے گانے اب مشہور ہو چکے ہیں۔ بھکاری مجھے نہیں جانتا تھا،لیکن وہ میرے گانوں کو جانتا تھا۔''

زندگی کے آخری دنوں میں آنند بخشی دل اور پھیپھڑوں کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔اس کی ایک بڑی وجہ ان کی کثرت سگریٹ نوشی تھی۔''بیکٹریل انفیکشن'' کی وجہ سے ان کے کئی اعضاء نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔لہٰذا انہیں ممبئی کے ناناوتی ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ بیماری کی تاب نہ لاکر ۳۰؍مارچ ۲۰۰۲ء کو وہ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

آنند بخشی کی نغمہ نگاری کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نغموں کی فضا صاف و شفاف اور تصنع سے پاک ہے۔صاف ستھری اردو اور ہندی آمیز زبان میں وہ اپنا مافی الضمیر ادا کر دیتے ہیں۔ یہی ان کے نغموں کا وصف خاص بھی ہے۔آنند بخشی کو اپنی مٹی سے بے انتہا محبت تھی۔یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر تاعمر ماضی سے توانائی حاصل کرتی رہی۔اس کا اکثر انکشاف ان کے گیتوں سے بھی ہو جاتا ہے۔مثلاً ان کا یہ گیت دیکھیں جس میں بھولے بسرے ہوئے ساتھی اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے بچپن کی یادیں کس قدر تازہ ہو رہی ہیں:

آیا ہے مجھے پھر یاد وہ ظالم گزرا زمانہ بچپن کا
ہائے اکیلے چھوڑ کے جانا اور نہ آنا بچپن کا
وہ کھیل وہ ساتھی وہ جھولے وہ دوڑ کے کہنا آ چھو لے
ہم آج تلک بھی نہ بھولے وہ خواب سہانا بچپن کا
اس کی سب کو پہچان نہیں یہ دو دن کا مہمان نہیں
مشکل ہے بہت آسان نہیں یہ پیار بھلانا بچپن کا
مل کر روئیں فریاد کریں ان بیتے دنوں کو یاد کریں
اے کاش کہیں مل جائے کوئی جو میت پرانا بچپن کا

بخشی،اکثر ماضی کو یاد کر کے افسردہ بھی رہتے۔راولپنڈی کا مقامی رنگ ان کی شخصیت میں اس قدر رچ بسا تھا کہ تاعمر اس سے دامن نہ چھڑا سکے۔کرب ہجرت کی عکاسی ان کی حسب ذیل غزل سے بھی صاف ظاہر ہے:

سانحہ یہ مری زندگی سہہ گئی
میں یہاں آ گیا وہ وہاں رہ گئی
کچھ نہیں کر سکا دیکھتا رہ گیا
کچھ نہ وہ کر سکی دیکھتی رہ گئی
لوگ کہتے ہیں تقسیم سب ہو گیا
جو نہیں بٹ سکی چیز وہ رہ گئی
راستوں میں کھڑی ہو گئیں سرحدیں
سرحدوں پر کھڑی بے بسی رہ گئی
یاد پنڈی کی آتی ہے اب کس کے لیے
میری مٹی تھی، جہلم میں وہ بہہ گئی
ان زمینوں نے کتنا لہو پی لیا
یہ خبر آسمانوں تلک رہ گئی
دے گئی گھر گلی شہر میرا کسے
کیا پتہ کس سے بخشی وہ کیا کہہ گئی

اپنی مٹی اور اپنوں سے دوری، تقسیم وفسادات کا گہرا غم اور کرب ہجرت ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ رہے۔یہی وجہ ہے کہ اس

کرب کی ٹیس ان کے نغموں کی جان بن گئی۔ مذکورہ غزل کے سلسلے میں بخشی کے ہاں موجود دردوفراق اور مایوسی کو محسوس کرتے ہوئے مخمور سعیدی لکھتے ہیں کہ:

''آنند بخشی فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں لیکن وہ غزلیں اور نظمیں بھی لکھتے رہے ہیں۔ یہ غزل انھوں نے اپنے شہر راولپنڈی کی یاد میں کہی ہے جس میں اس شہر کو انھوں نے انسانی تشخص دے دیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک ملاقات میں انھوں نے یہ غزل سنائی تو میں نے اسے ایوان اردو کے لیے ان سے لے لیا، اب قارئین کی نذر ہے۔''

(ایوان اردو۔مخمور سعیدی۔ص:۱۱۔اپریل۱۹۹۹ء)

اسی طرح ان کی حسب غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں جن میں کرب ہجرت بھی ہے، اعتماد بھی ہے اور کچھ کر دکھانے کا جنون بھی:

میں کوئی برف نہیں ہوں جو پگھل جاؤں گا
میں کوئی حرف نہیں ہوں جو بدل جاؤں گا
چاند سورج کی طرح وقت پر نکلا ہوں میں
چاند سورج کی طرح وقت پر ڈھل جاؤں گا
قافلے والے مجھے چھوڑ گئے ہیں پیچھے
قافلے والوں سے آگے میں نکل جاؤں گا
روک سکتی ہے اگر روک لے دنیا بخشی
میں تو جادو ہوں، جادو ہوں میں چل جاؤں گا

آنند بخشی کے نغموں کی خاصیت حقیقت بیانی ہے۔ان کے گیتوں میں زندگی اپنے تمام تر ساز وآواز کے ساتھ موجود ملتی ہے۔وہ بھی اس قدر فطری انداز میں کہ گویا یہ ہمارے ہی محسوسات ہوں۔مثال کے طور پر فلم اپنا پن (۱۹۷۷ء) کے مشہور نغمے سے یہ سطریں دعوت غور وفکر دیتی ہیں۔مثلاً:

آدمی مسافر ہے، آتا ہے اور جاتا ہے
آتے جاتے رستے میں، یادیں چھوڑ جاتا ہے
جھونکا ہوا کا پانی کا ریلا، میلے میں رہ جائے جو اکیلا
پھر وہ اکیلا ہی رہ جاتا ہے

یا پھر فلم دشمن (۱۹۹۸ء) کا یہ نغمہ ہو:

چٹھی نہ کوئی سندیس، جانے وہ کون سا دیس، جہاں تم چلے گئے
اس دل پہ لگا کے ٹھیس، جانے وہ کون سا دیس، جہاں تم چلے گئے

آنند بخشی کے نغموں میں انسانی جذبات پورے شدومد کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں۔سادہ اور پراثر لفظوں کا کمال ان کے نغمات کی فضا کو مزید پرتاثیر کردیتا ہے۔مثلا فلم آرادھنا (۱۹۶۹ء) کا یہ مشہور نغمہ اوراس میں شدت جذبات کی برانگیختگی لائق ستائش ہے:

روپ ترا مستانہ، پیار مرا دیوانہ، بھول کوئی ہم سے نہ ہو جائے
رات نشیلی، مست سماں ہے، آج نشے میں، سارا جہاں ہے
ہائے شرابی موسم بہکائے......

اسی طرح کی شدت فلم فیئر ایوارڈ یافتہ ان کے گیت ''ترے مرے بیچ میں کیسا ہے یہ بندھن انجانا'' (فلم: ایک دوجے کے لئے۔۱۹۸۱ء) میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔اس گانے کا بند کس قدر پر کیف ہے دیکھیں:

اک ڈور کھینچے دوجا......دوڑا چلا آئے......
کچے دھاگے سے......بندھا چلے آئے......
ایسے جیسے کوئی دیوانہ......

موسیقیت و جاذبیت سے پر ان کا بہترین نغمہ فلم تال (۱۹۹۹ء) کا ''عشق بنا'' بھی ہے، جس میں عشق کی لذت اور اس کی اثرانگیزی کا پرتاثیر بیان ملتا ہے۔اسے مزید پرتاثیر اور

صوفیانہ رنگ اے آر رحمٰن کی موسیقی نے عطا کر دیا ہے۔ مثلاً یہ سطریں دیکھیں:

نیچے عشق ہے......اوپر رب ہے......
ان دونوں کے......بیچ میں سب ہے......
ایک نہیں سو......باتیں کرلو......
سو باتوں کا......اک مطلب ہے......
رب سب سے سونا......عشق عشق......
رب سے بھی سونا......عشق......

آنند بخشی کے نغموں کی دلکشی اور جاذبیت کو اجاگر کرنے اور اسے مزید کیف آور بنانے میں اردو اور ہندی زبانوں کی آمیزش کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ ان دونوں زبانوں کی رنگینی واختلاط، نغموں کی فضا کو جاذبیت بخشتے ہوئے اسے پر تاثیر کر دیتی ہے۔ بالخصوص اردو کے سادہ عام فہم الفاظ سے وہ اپنے نغموں کی کہکشاں اس طرح سجاتے ہیں کہ نغموں کا حسن و لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر فلم ''جب جب پھول کھلے'' (۱۹۶۵ء) سے یہ سطریں ملاحظہ کریں:

کہاں شام وسحر یہ......کہاں دن رات میرے......
بہت رسوا ہوئے ہیں......یہاں جذبات میرے......
نئی تہذیب ہے یہ......نیا ہے یہ زمانہ......
مگر میں آدمی، میں ہوں......وہی صدیوں پرانا......
میں کیا جانوں یہ باتیں......ذرا انصاف کرنا......
مری گستاخیوں کو......خدارا معاف کرنا......
یہاں میں اجنبی ہوں......

اسی طرح فلم ''آئے دن بہار کے'' (۱۹۶۶ء) سے اس نغمے کو دیکھیں جو بالی ووڈ میں اپنی نوعیت کا پہلا منفرد نغمہ تھا جس میں عاشق کی افسردہ دلی بددعا بن کر نکل رہی تھی۔ غالباً اس سے قبل کسی بھی نغمہ نگار نے اس قسم کا گانا ہندی فلم میں نہیں پیش کیا تھا:

تو پھول بنے پت جھڑ کا،......تجھ پہ بہار نہ آئے کبھی......
میری ہی طرح تو تڑپے......تجھ کو قرار نہ آئے کبھی......
جیے تو اس طرح کہ......زندگی......کو ترسے......
مرے دشمن......تو میری......دوستی......کو ترسے......

ٹھیک اسی طرح فلم: جوانی دیوانی (۱۹۷۲ء) کا یہ نغمہ بھی خوبصورت پیراہن لفظ سے مزین، دلکش لگتا ہے:

او میرے ہم سفر......پیار کی راہ پر......
ساتھ چلے......ہم مگر......کیا خبر......
راستے میں کہیں......رہ گئے ہم نشیں......تم کہاں؟......
میں یہاں......تم کہاں؟......

ہندی زبان کا استعمال بھی آنند بخشی کے ہاں بالکل فطری انداز میں ہوتا ہے۔ وہ ایسے لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں جو غیر مانوس نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گیتوں کا صوتی آہنگ سماعت کو بھلا لگتا ہے۔ مثلاً فلم ''ملن'' (۱۹۶۷ء) کا یہ گیت دیکھیں:

ہم تم......یگ یگ سے یہ گیت ملن کے......
گاتے رہے ہیں......گاتے رہیں گے......
ہم تم......جگ میں جیون ساتھی بن کے......
آتے رہے ہیں......آتے رہیں گے......

یا پھر فلم ''ڈر'' (۱۹۹۳ء) کے نغمہ کے یہ بند ملاحظہ کریں:

انگ سے انگ لگانا......سجن ہمیں ایسے رنگ لگانا......
گالوں سے یہ گال لگا کے......نینوں سے یہ نین ملا کے......
ہولی آج منانا......سجن ہمیں ایسے رنگ لگانا......

اسی طرح ہندی زبان میں لکھا ہوا فلم ''دشمن'' (۱۹۹۸ء) کا یہ گیت بھی ملاحظہ کریں جسے جگجیت سنگھ نے اپنی آواز دے کر مزید

پرسوز بنادیا ہے۔مثلاً:

چٹھی نہ کوئی سندیس......جانے وہ کون سا دیس......

جہاں تم چلے گئے......

اردو اور ہندی کے علاوہ ان کے نغموں میں پنجابیت کا عنصر بھی موجود رہا۔چونکہ ان کی زبان ہی پنجابی تھی اس لیے یہ زبان اپنے فطری پن کے ساتھ ان کے نغموں کی جاذبیت بڑھانے میں معاون رہی۔مثلاً''میں جٹ یملا پگلا دیوانہ'' (فلم: پرتگیا،۱۹۷۵ء)اور''میں نکلا گڈی لے کے''(فلم غدر:۲۰۰۱ء) وغیرہ کی زبان پنجابی ہونے کے باوجودعوام میں مقبول رہی۔کئی نغموں کی شروعات میں اور کہیں درمیان میں بھی اس زبان کا استعمال بخشی نے خوبصورتی سے کیا۔اس کی تصدیق''اے کڑیاں نشے دیاں پڑیاں''(دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔۱۹۹۵ء) اور''سونی سونی انکھیوں والی'' (فلم:محبتیں،۲۰۰۰ء) سے بھی ہو جاتی ہے۔غرض کہ آرادھنا(۱۹۶۹ء)، ہرے راما ہرے کرشنا (۱۹۷۱ء)، بابی (۱۹۷۱ء)، امر پریم (۱۹۷۱ء)، آئے دن بہار کے(۱۹۷۵ء)،ہم(۱۹۹۱ء)،موہرا(۱۹۹۴ء)دشمن(۱۹۹۸ء)، محبتیں (۲۰۰۰ء)، غدر۔ایک پریم کتھا (۲۰۰۱ء) اور یادیں (۲۰۰۱ء) جیسی سپرہٹ فلموں میں نغمہ نگاری کے ذریعہ آنند بخشی نے نہ صرف سامعین کے دلوں کو مسخر کیا اور نغمہ نگاری میں اپنی منفرد شناخت بنائی بلکہ اپنا کمال فن بھی پیش کردیا۔بلاشبہ آنند بخشی نغموں کی دنیا کے جادوگر تھے،جن کی جادوگری ان کے نغموں کے طفیل ہر دور میں سننے والوں پر اپنا سحر طاری کرتی رہے گی۔

❖❖❖

Sadiya Sadaf
C/O Faragh Rohvi, 67, Colootola Street
(Maulana Shaukat Ali Street)
Kolkata (WB)
Mob. 9831365693

تخلیق کاروں سے گزارش

- ❖ ماہنامہ''خبرنامہ'' کے لئے معیاری نگارشات ہی ارسال کریں۔ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔ساتھ ہی مکمل ایڈریس،موبائل نمبر، پاسپورٹ سائز تصویر بھیجیں۔
- ❖ مضمون بہت طویل نہ ہو، زیادہ سے زیادہ دو ہزار الفاظ ہوں۔
- ❖ ای۔میل سے بھیجی ہوئی نگارشات کا پروف اچھی طرح پڑھ لیں، اِن پیج فائل کے ساتھ پی ڈی ایف بھی بھیجیں۔
- ❖ تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ایف۔ ایس۔سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے، پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

اتر پردیش اردو اکادمی
بچوں کے مزاج ومعیار کے لحاظ سے ماہنامہ
باغیچہ
پورے آب وتاب کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔اس کے فروغ اور توسیع کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے۔
آپ اپنی تخلیقات بھیج کر،خود خریدار بن کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر اور بچوں میں اردو رسائل پڑھنے کا ذوق پیدا کر کے
اردو کی خدمت کر سکتے ہیں

ایس معشوق احمد

کشمیر

انشائیہ

روٹھنا

روٹھنا ایک ادا ہے اور منانا ایک ہنر۔ آدمی بھلے ہی ادا نہ جانتا ہو لیکن ہنر مند ضرور ہونا چاہیے کہ ہر وقت اسے ہنر سے کام پڑتا ہے۔ اس سے کبھی بیوی روٹھ جاتی ہے تو کبھی محبوبہ، کبھی صاحب روٹھ جاتا ہے تو کبھی لکشمی دیوی، کبھی دوست، احباب روٹھ جاتے ہیں تو کبھی رشتہ دار۔۔۔ جس نے ہنر سے کام لیا وہ کامیاب ہوا جس کو یہ ہنر نہ آیا اس کی زندگی غم کی تصویر بنی۔ ہر فرد کی طرح ہمیں بھی اس ہنر کو سیکھنا پڑا۔ جی ہاں آپ کی طرح ہماری زندگی میں بھی ایسے بے شمار افراد آئے جو معمولی باتوں پر ہم سے روٹھ بیٹھے۔ کبھی ہم انہیں منانے میں کامیاب ہوئے تو کبھی ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسفند قادری نے سنا تو فرمانے لگے میاں دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے، روٹھنے والوں کو منانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ گر اپنے ہوئے تو مان جائیں گے گر بیگانے بننے کے لئے روٹھ گئے ہیں تو منانے کا ہنر وقت کو سونپ دینا چاہیے جس سے سارے راضی اور خوش ہوتے ہیں۔ ارے صاحب ہم بھی کیا وقت کو بیچ میں لائے۔ مرزا کہتے ہیں کہ وقت وہ بے رحم تلوار ہے جو دھیرے سے اتنا گہرا زخم دیتی ہے کہ جب تک بندہ علاج کرنے کی سوچتا ہے زندگی روٹھ گئی ہوتی ہے۔

صاحبو! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم روٹھنے منانے پر کیوں آئے۔ حال ہی میں ہمارے ساتھ عجیب واقعہ ہوا۔ میرے سامنے والی کھڑکی میں جو چاند کا ٹکڑا رہتا ہے وہ اچانک ہم سے روٹھ گیا۔ اس کو منانے کے لئے ہم نے ہزار جتن کئے، خوشامد اور چاپلوسی سے بھی کام لیا لیکن ان کا ہمارے تئیں غصہ کم نہ ہوا۔ وہ کیوں روٹھے اس لمبی داستان کو مختصر بیان کرتا ہوں تا کہ آپ کو اکتاہٹ نہ ہو۔ جب سے سردی نے ناک میں دم کر رکھا ہے ہم نے پانی کو اپنا جانی دشمن تصور کر لیا ہے۔ ہم نے نہانے کا اپواس رکھ لیا ہے لیکن کل اچانک ہم نے آئینہ دیکھا تو اپنا حلیہ دیکھ کر ہمیں بڑی شرمندگی ہوئی۔ صفائی آدھا ایمان ہے اس پر ہمیں یقین ہے سو اپنا آدھا ایمان مکمل کرنے کے لئے ہم نے غسل خانے کا رخ کیا، جو گھر کی دوسری منزل پر واقع ہے۔ پچھلے چند برس سے جب ہمیں نہانے کی ضرورت پڑتی ہے ہم اوپری منزل پر بنے غسل خانے میں ہی نہاتے ہیں۔ ہم پر اوپری منزل کا بھوت کیوں سوار ہے، اس کی اہم وجہ ہے کہ ہمیں گانے کی خطرناک لت پڑ گئی ہے۔ ہماری آواز اتنی سریلی ہے کہ سوائے باتھ روم کے کسی جگہ اس شوق کو ہم پورا کر ہی نہیں سکتے۔

سو باتھ روم جا کر ہی اپنے شوق کی تسکین کرتے ہیں اور دل کو شاد کرتے ہیں۔ عادت سے مجبور ہم نے اپنی سریلی اور مدھر آواز میں گانا شروع کیا۔

'تم روٹھا نہ کرو میری جان میری جان نکل جاتی ہے'

ہماری سریلی اور مدھر آواز جس چرند، پرند نے سنی وہ واقعی روٹھ گیا۔ حد تو یہ ہے کہ جان سے لے کر جان من تک کے ماتھے پر شکن آئی۔ مرزا نے بار ہا ہمارے گانے کی تعریف کی اور کہا کہ میاں اتنی سریلی آواز میں نہ گایا کرو، نظر لگ جائے گی اور جو بھی تمہارا گانا سننے گا وہ تم سے ایسے روٹھ جائے گا جیسے لکشمی دیوی افلاس زدہ شخص سے روٹھ جاتی ہے۔ بھلے ہی مرزا نے ہماری اتنی تعریفیں کیں ہم نے اپنی آواز پر کبھی ناز نہ کیا۔ ہم تو دھیمے دھیمے ہی گاتے ہیں یہ تو برا ہو سردی کا جس کی وجہ سے ہمارے دانت بجنے لگے اور آواز اتنی تیز ہوئی کہ پڑوسن کے کان تک جا پہنچی جس کو ہم پیارے سے جان کہتے ہیں۔ جان نے فوراً کھڑکی کھول دی اور کہا کہ اے جان یوں اپنی جان کو بدنام اور رسوا کرتے ہو۔ آج سے ہماری بات چیت بند۔ ہم شاعری کا سہارا لینے ہی والے تھے کہ:

انتہائی حسین لگتی ہو
جب کرتی ہو روٹھ کر باتیں

لیکن انھوں نے سنا تک نہیں اور زور سے کھڑکی بند کردی۔ مرزا کہتے ہیں کہ برا وقت دستک دے تو بیوی سے لے کر محبوبہ تک، ملازم سے لے کر نوکر تک اور جان سے لے کر جان من تک سب روٹھ جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ روٹھے رب کو منانا آسان ہے پر روٹھے یار کو منانا مشکل۔ بھلا ہو شعراء کرام کا جنھوں نے ایسے ایسے حسین شعر لکھے ہیں جن کی بدولت روٹھے یار کو منانا آسان ہو گیا ہے۔ جب شعر کا سہارا ہم نے بھی لیا تو جان پھر سے جان وارنے کے لئے تیار ہوئی۔ صاحبو! آپ کی بھی اگر جان من روٹھ جائے تو آپ بھی اس شعر کا سہارا لے کر اس کو منانے کی کوشش کر سکتے ہیں___

زندگی یوں ہی بہت کم ہے محبت کے لیے
روٹھ کر وقت گنوانے کی ضرورت کیا ہے

بعض لوگوں کے عادات و اطوار کو دیکھ کر بندہ خواہش کرتا ہے کاش یہ روٹھ جائے لیکن اول وہ روٹھتے ہی نہیں، باد ل ناخواستہ روٹھ جائیں تو انہیں منانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ مرزا کہتے ہیں کہ قرض مانگنے والا دوست، فضول خرچی کرنے والی بیوی، مہنگی مہنگی فرمائشیں کرنے والی محبوبہ روٹھ جائے تو بندے کو شکر بجالانا چاہیے۔ صاحبو! روٹھنا منانا تو چلتا رہے گا لیکن کچھ نازک رشتے ایسے ہوتے ہیں جو روٹھ جائیں تو ان کو فوراً منالینا چاہیے جیسے والدین، بچہ اور محبوبہ۔ والدین ہلکی مسکراہٹ سے راضی ہوتے ہیں بچہ روٹھ جائے تو اس کی فرمائش پوری کرنے سے وہ کھلکھلاتا ہے اور محبوبہ روٹھ جائے تو اس کو منانے کے لئے شعراء نے بے شمار صفحے سیاہ کئے ہیں ان کا سہارا لیجیے اور محبوبہ کو راضی کیجیے۔ مرزا کہتے ہیں کہ میاں روٹھنا اور خفا ہونا انسان کی فطرت میں ہے۔ اس جذبے کا اظہار انسان اپنوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اپنے خفا ہو جائیں تو ان کو منانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے اور ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ وہ روٹھے ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت وہ آپ سے خوش اور راضی رہے۔

❖❖❖

S mashooq Ahmad
kelam near ziyarat shareef Takibal
Teh-:Devisar, Distt-**kulgam**, (Kashmir)
Pin code-192231
Mob. 8493981240

ڈاکٹر اطہر حسین

پنجاب

شبلی نعمانی کی مکتوب نگاری

اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں علامہ شبلی نعمانی کا نام بہت منفرد اور ممتاز ہے۔ مکتوب نگاری میں غالب کا کوئی مد مقابل نہیں البتہ غالب کے بعد اس فن کو فراغ بخشنے والوں میں ایک اہم نام شبلی نعمانی کا ہے۔ مکاتیب شبلی میں خطوط غالب کے اثرات اور شگفتگی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ شبلی نعمانی کے خطوط میں مختصر، سادہ اور موزوں عبارت ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ ان کا کوئی متعین اسلوب نہ تھا بلکہ مکتوب الیہ کے حساب سے طرز بیان بدلتا رہتا تھا۔ مفصل خطوط کے ساتھ ساتھ ایک دو جملوں میں بھی جواب دیا کرتے تھے۔ پابندی سے نہ صرف یہ کہ خطوط لکھتے بلکہ جواب دینے میں بھی جلدی کرتے تھے۔ شاگردوں اور عزیزوں سے جواب نہ ملنے پر ناراضگی کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ خطوط کا شدت سے انتظار کرتے تھے۔ خطوط میں القاب و آداب کی کوئی خاص پابندی نظر نہیں آتی۔ شبلی نعمانی نے احباب و معاصرین کو سیکڑوں خطوط لکھے۔ ان خطوط سے ان کی زندگی کے مختلف پہلو، مشاغل، ملکی ،قومی ، مذہبی، علمی اور اصلاحی خیالات و مسائل کے علاوہ ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مکمل احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

شبلی نعمانی نے تصنیف و تالیف کی طرح خطوط نگاری کی ابتدا فارسی اور عربی سے کی۔ ابتدا میں وہ اردو میں لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ علی گڑھ آنے کے بعد اردو میں لکھنا شروع کیا البتہ وہاں بھی ابتدائی دنوں میں فارسی مکتوب نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ شبلی اپنے اردو خطوط سے زیادہ فارسی خطوط کو پسند اور جمع کرنے قائل تھے۔ چنانچہ اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں ''ایں نامہ رانز د خود نگاہ بایداشت'' (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص 225)۔ دستیاب فارسی خطوط کی تعداد 33 ہے جبکہ عربی کے صرف چند خط دستیاب ہیں۔ ان تمام خطوط کو سید سلیمان ندوی نے مکاتیب شبلی حصہ دوم میں شامل کر لیا تھا۔ فارسی کا پہلا خط والد شیخ حبیب اللہ کے نام لاہور سے لکھا تھا جس پر 1872 کی تاریخ درج ہے۔ واضح رہے کہ اب تک کے دستیاب خطوط میں یہ سب سے قدیم خط ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے فارسی خطوط نگاری کی ابتدا 1872 میں کی تھی۔ آخری خط آغا خاں کے نام ہے، جس پر تاریخ درج نہ ہونے کی وجہ سے قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط کب لکھا گیا البتہ خط میں آغا خاں کی دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک دو دن میں تشریف آوری کی بات درج ہے اور تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ 31 جنوری 1910 کو لکھنؤ پہنچے تھے اور 3 فروری کو ندوہ آئے تھے۔ (حیات شبلی ص 493) چنانچہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ 2 فروری 1910 کو لکھا گیا ہوگا۔ شبلی نعمانی کے تمام فارسی خطوط کو ڈاکٹر خالد ندیم نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع

کردیا ہے۔

اردو خطوط نگاری کی باضابطہ ابتدا علی گڑھ آنے کے بعد ہوئی اور 1881 سے 1914 کے درمیان بڑی تعداد میں خطوط لکھے۔ اردو میں دستیاب خطوط کی تعداد بارہ سو سے زائد ہے۔ ایک اندازے کے مطابق شبلی نعمانی کے خطوط کی جو تعداد ہونی چاہیے اس کا دسواں حصہ بھی دستیاب نہیں ہوا ہے۔ شبلی نعمانی کے خطوط کو جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے رشیدالدین انصاری نے پیش کیا تھا، جس کے جواب میں علامہ شبلی نعمانی نے لکھا تھا کہ ''میرے خطوط بالکل بدمزہ ہوتے ہیں، ان کو کیا جمع کرتے ہو، مجھ کو خود مزہ نہیں آتا تو اوروں کو کیا آئے گا۔'' (مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص 324)۔ سید سلیمان ندوی بھی ایک مدت سے شبلی نعمانی کے خطوط کو جمع کرنا چاہتے تھے۔ علامہ شبلی ابتدا میں خطوط مرتب ہونے کے خلاف تھے۔ شبلی کے خطوط کی حصول یابی کے لیے جب سید سلیمان ندوی نے الندوہ میں اعلان کیا تو شبلی نے برہمی کا اظہار کیا تھا۔ شاگرد محمد سمیع کو اس حوالے سے لکھا کہ ''جو خط کسی قدر حاصل ہوں اس کو سید سلیمان ندوی کے پاس نہ بھیجو فرصت کے وقت میں خود دیکھ کر فیصلہ کرونگا'' (مکاتیب شبلی حصہ اول ص 100) البتہ بعد میں راضی ہو گئے اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھا کہ 'سید صاحب ان خطوط کو جمع کر رہے ہیں کچھ ہفوات محفوظ رہ گئے ہوں تو مجھے بھیج دو' (ذکر غالب، مالک رام، ص 169)۔ چنانچہ 1909 میں جب اس کی ترتیب کا کام شروع ہوا تو بڑی تعداد میں خطوط موصول ہونے لگے۔ واضح رہے کہ سید سلیمان ندوی نے شبلی کے خطوط کی جمع و ترتیب کا کام ان کی زندگی میں ہی شروع کردیا تھا، البتہ ان کے انتقال کے تین سال بعد مکاتیب شبلی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔

مکاتیب شبلی (حصہ اول) مرتبہ سید سلیمان ندوی، مطبوعہ مطبع شاہی لکھنؤ 1916۔ اس میں 400 خطوط شامل ہیں، جو انہوں نے اپنے معاصرین اور بزرگوں کے نام لکھے تھے۔ مکاتیب شبلی (حصہ دوم) مرتبہ سید سلیمان ندوی، مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ 1917۔ اس میں 379 خطوط شامل ہیں۔ اس میں وہ خطوط شامل ہیں جو احباب اور تلامذہ کے نام لکھے گئے۔ شبلی کے مکتوب الیہ کا دائرہ کار متنوع اور وسیع ہے۔ مذکورہ دونوں مجموعوں میں مکتوب الیہ کی تعداد 68 ہے۔ اس میں عالم و فاضل، ادیب و شاعر، نقاد و ماہر تعلیم، قانون داں، سیاست داں، دوست و احباب اور خالص علمی شخصیات شامل ہیں۔ ان خطوط میں شبلی نعمانی نے القاب و آداب کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔ عام القاب سے دوست و احباب کو موسوم کیا ہے۔ اگر کسی مکتوب الیہ کے نام ایک سے زائد خط لکھے ہیں تو تقریبا ایک طرح کے ہی القاب کا استعمال کیا ہے۔ مثلا بڑوں کے لیے مکرمی و مخدومی، جناب من، قدر افزائے من اور پائے افزائے من جیسے القاب کو کثرت سے استعمال کیا ہے، البتہ سرسید احمد خاں کے لیے سیدی، مولائی بھی لکھا ہے۔ اسی طرح چھوٹوں اور شاگردوں کے لیے عزیزی اور عزیزم کا استعمال کیا ہے۔ خط کی ابتدا میں مختصر سلام اور آداب لکھا ہے۔ دعا دینے کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔ مذکورہ خطوط سے مختلف شہروں میں قیام کا بھی پتہ چلتا ہے، جن میں حیدرآباد، لکھنؤ، علی گڑھ، اعظم گڑھ، ممبئی، کلکتہ، الہ آباد، بھوپال، قسطنطنیہ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ خطوط پر تاریخ لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطوط تقریبا چھ دہائیوں پر محیط ہیں۔

شبلی نعمانی نے نہ صرف یہ کہ قوم و ملت، مذہب و سیاست، تعلیم و تربیت کے مسائل سے دلچسپی لی بلکہ مسلسل تصنیف و تالیف میں مصروف زندگی گزاری۔ اس لیے پروفیسر خورشید الاسلام نے شبلی کے خطوط کو قومی اعمال نامہ قرار دیا ہے۔ (تنقیدیں، خورشید الاسلام، ص 52) اسی طرح شمس بدایونی نے قومی روزنامچہ قرار دیا ہے۔

(ماہنامہ معارف فروری 2006 ص119)۔شبلی کے خطوط میں موضوعات کا بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔اس میں شبلی کی ذاتی زندگی، کتابوں پر معلومات، تاریخ وسنین، علمی منصوبے، انجمن واداروں پر گفتگو، قومی وملت کے تئیں فکرمندی، ملکی وملی مسائل، تعلیم وتربیت، شعروادب اور احباب ومعاصرین کا تذکرہ ملتا ہے۔خطوط میں شبلی کے حالات اور مشاغل کا کثرت سے تذکرہ ہوا ہے، ان خطوط کی مدد سے شبلی نعمانی کی سوانح حیات مرتب کی جاسکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی کو سوانح کے بجائے خودنوشت قرار دیا ہے۔تحریک ندوہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالمصنفین کے قیام کے حوالے سے بھی بڑی تعداد میں خطوط لکھے ہیں، جن کی مدد سے بآسانی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ابوعمیر منظر نے شبلی نعمانی کے ندوۃ العلماء کے حوالے سے لکھے گئے خطوط کو 'شبلی، مکاتیب شبلی اور ندوۃ العلماء' کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے، جن کی تعداد 200 ہے۔

شبلی کی ایک حیثیت ماہر تعلیم کی ہے۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ متعدد اداروں کو استحکام بخشا بلکہ کئی ادارے بھی قائم کیے۔اس کے علاوہ اصلاح نصاب میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔مکاتیب شبلی کے مطالعہ سے ان کے نظریہ تعلیم سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔تعلیم کے سلسلہ میں انہوں نے جو بھی کوششیں کیں وہ ان کے خطوط میں موجود ہے۔شبلی نعمانی ایک خط میں لکھتے ہیں: ''میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ، علماء کا ہمیشہ قاضی ابو یوسف کے زمانہ سے ایک خاص لباس رہا ہے، طلبہ بھی اسی کے قریب قریب استعمال کرتے تھے۔'' (مکاتیب شبلی جلد اول 153)۔اسی طرح ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''افسوس کی عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا پرتو نہیں۔جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا جدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصل ترقی نہ ہوسکے گی۔یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے۔'' (خطوط شبلی، ص29)۔

شبلی کے علمی منصوبوں کا تذکرہ خطوط میں کثرت سے ملتا ہے۔وہ جب کبھی بھی کسی موضوع پر لکھنے کا اردہ بناتے تو خطوط کے ذریعہ اپنے احباب کو ضرور مطلع کرتے تھے۔یا پھر کہیں کوئی کتاب نظر سے گزرتی تو اس کا تذکرہ خطوط میں ضرور کرتے تھے۔احباب اور معاصرین کی کتابوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔یہی وجہ ہے مکاتیب شبلی میں مختلف موضوعات کی سیکڑوں کتابوں کا تذکرہ ہے۔اس کے علاوہ شبلی نعمانی کے خطوط سے عہد شبلی کی متعدد تاریخوں کا تعین کیا جاسکتا ہے۔غرض یہ کہ مکاتیب شبلی کے مطالعہ کے بغیر شبلی کی شخصیت کا صحیح ادراک ممکن نہیں۔مکاتیب شبلی کی مذکورہ دو جلدوں کے علاوہ 'خطوط شبلی' کے نام سے ایک مجموعہ محمد امین زبیری اور منشی سید یوسف قیصر نے مرتب کر کے 1926 میں آگرہ سے شائع کیا، جس میں عطیہ بیگم فیضی (1877-1967) اور زہرہ بیگم فیضی (1866-1940) کے نام لکھے گئے ۱۰۰/ خطوط ہیں، جس میں ۵۵/ خطوط عطیہ فیضی کے نام اور ۴۵/ خطوط زہرا فیضی کے نام ہیں۔اس کا دوسرا ایڈیشن صرف محمد امین زبیری نے مرتب کیا ہے، جسے تاج کمپنی لاہور نے شائع کیا تھا۔ ان دو ایڈیشنوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے میں ۱۰۰/ خطوط شامل ہیں جبکہ دوسرے میں صرف 81 خطوط ہیں۔ایک فرق یہ بھی ہے کہ پہلے ایڈیشن میں صرف مولوی عبدالحق کا مقدمہ شامل تھا جبکہ دوسرے میں مرتب کا دیباچہ بھی شامل ہے۔شبلی کی شخصیت کے سب سے متنازع پہلو یہی خطوط ہیں، جو عطیہ فیضی کے نام لکھے گئے۔اس کی شروعات خطوط شبلی میں شامل مولوی عبدالحق کے مقدمہ سے ہوتی ہے، جس میں انھوں نے شبلی کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی تھی۔انھوں نے شبلی نعمانی کو نہ صرف یہ کہ

اکل کھرا اور تنگ مزاج لکھا بلکہ ان کی کتابوں پر لونی لگنے کا الزام لگایا، جس کے بعد خطوط شبلی کو صرف اسی ناحیہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ خطوط شبلی کو ہی سامنے رکھ کر ڈاکٹر وحید قریشی نے 'شبلی کی حیات معاشقہ' لکھی اور شیخ اکرام نے شبلی نامہ میں وادی گل لکھ کر ان مباحث کو حقیقت کے قریب لانے کی کوشش کی۔ البتہ ان الزامات کے جواب میں بعد میں متعدد مدلل تحریریں لکھی گئی، جن میں محمد الیاس الاعظمی 'آثار شبلی'، ڈاکٹر شباب الدین' دارالمصنفین کی ادبی خدمات کا تعارف'، سید شہاب الدین دسنوی 'شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں'، عبدالطیف اعظمی 'شبلی کے منتقد اور معتقد' اور ڈاکٹر ابن فرید کا مضمون 'شبلی چوں بہ خلوت می رود' قابل ذکر ہیں۔ ان میں ابن فرید کا مضمون حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

ابن فرید نے خطوط اور دیگر شواہد کی روشنی میں نہ صرف یہ ان الزامات کو رد کیا بلکہ اس کا صحیح مفہوم بھی واضح کیا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ شبلی عطیہ فیضی کے ذریعہ خواتین میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اور خود عطیہ فیضی ان سے استفادہ کر کے نام پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے انہوں علامہ اقبال اور سر عبدالقادر سے ربط رکھا۔ (ادیب علی گڑھ، شبلی نمبر ص 268) ابن فرید کے مضمون کا اثر یہ ہوا کہ شیخ اکرام نے شبلی نامہ کو یادگار شبلی کر دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے نہ صرف یہ کہ اپنی نارسائیوں کا اعتراف کیا بلکہ شبلی کی حیات معاشقہ کو اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا۔ مولوی عبدالحق نے بھی عبداللطیف اعظمی کے نام ایک خط میں لکھا کہ میں شبلی کا مخالف نہیں بلکہ انہیں اردو زبان وادب کے بڑے ادیبوں اور محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے آثار شبلی میں خطوط شبلی بالخصوص مقدمہ خطوط شبلی پر تفصیلی بحث کی ہے۔ انہوں نے مولوی عبدالحق کے مقدمہ کو شبلی شکنی کی منصوبہ بند کوشش، خطوط کی ترتیب میں تبدیلی اور غیر دیانت داری، خطوط کے موضوعات سے انحراف اور دیگر کئی اہم غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، آثار شبلی، ص 627 دارالمصنفین اعظم گڑھ 2013)۔ خطوط شبلی کے موضوعات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان میں شبلی اور فیضی کے مراسم، شعر وادب کے مباحث، فنون لطیفہ، تعلیم نسواں اور اس کے مسائل، اصلاح زبان، متعدد کتابوں کا تذکرہ، انشا وادب کی جلوہ گری اور ندوۃ العلماء کے حوالے سے خطوط شامل ہیں۔ شبلی کا بنیادی مقصد عطیہ فیضی کی شخصیت کی تعمیر، اصلاح اور ان سے علمی کام لینا تھا۔ شبلی نعمانی نے نہ صرف یہ کہ ان کے زبان و بیان کی اصلاح کی بلکہ بہت سے ایسے علمی مشورے دیے جنہیں عطیہ فیضی نے عملی جامہ پہنایا۔

مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی کے علاوہ ایک مجموعہ 'خطوط شبلی بنام آزاد' سید محمد حسنین نے 1988 میں بہار اردو اکیڈمی سے شائع کیا۔ اس میں 59 خطوط ہیں، جس میں سے 40 خطوط مکاتیب شبلی جلد دوم میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ باقیات شبلی کے نام سے مشتاق حسین نے اور مکتوبات شبلی کے نام سے محمد الیاس الاعظمی نے ایک مجموعہ شائع کیا۔ اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھے گئے خطوط علاحدہ شکل میں 'خطوط مشاہیر' کے نام سے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ایک مجموعہ رسائل شبلی کے نام سے شائع کیا، اس میں وہ خطوط شامل ہیں جو رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ مکاتیب شبلی کے کئی انتخاب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ شبلی کے ۱۸/۱ اہم خطوط جو خواجہ حسن نظامی کے نام تھے، خواجہ صاحب نے انہیں 'اتالیق خطوط نویسی' میں شامل کیا ہے۔

❖❖❖

Dr Athar Husain
Northern Regional Language Center
Punjabi University Campus
Patiala Punjab-147002
Mob. 8074378735

فاضل شفیع بھٹ

جموں وکشمیر

افسانہ

بنجر پور کا قبرستان

"بابا آپ میری رائے سے متفق کیوں نہیں ہیں؟ دیکھو اب میں ہرگز اس گاؤں میں نہیں رہ سکتا۔ یہ گاؤں ایک سنسان اور جنگلی علاقے میں واقع ہے۔ نہ سڑک ہے، نہ اسکول ہے، نہ بجلی ہے، نہ صاف پانی کا کوئی انتظام ہے۔ نیٹ ورک کا مسئلہ۔ گویا یہ گاؤں ایک ویرانہ ہے جہاں سرسبز پیڑ پودوں کی ہریالی اور ان پرانے دیودار کے درختوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے" فیض اپنے والد رحیم خان کے سامنے اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر کے نزدیک ہجرت کرنے کی ضد پر اڑا تھا۔

"دیکھ فیضے! تو میرا لخت جگر ہے۔ میں نے اس گاؤں میں زندگی کے ساٹھ برس گزارے ہیں۔ اس گاؤں کی مٹی کے ساتھ میری یادیں، میرا بچپن، میری جوانی منسلک ہے۔ مجھے اس گاؤں کی مٹی سے بے حد لگاؤ ہے۔ اس مٹی کی خوشبو میری روح کو تروتازہ کرتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ گاؤں ترقی یافتہ تو نہیں ہے لیکن کیا تیری پرورش میں کوئی کمی پیش آئی؟ کیا تم اعلی تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہے؟"

تمہیں سرکاری نوکری کیا ملی، تم نے اپنے تیور ہی بدل ڈالے۔ کیا تم گاؤں کے پرسکون اور صاف وشفاف ماحول کو لات مار کر شہر کی آلودگی میں رہنا پسند کروگے؟ رحیم خان کے لہجے میں التجا تھی۔

"نہیں بابا۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ میں آپ کا خون ہوں۔ آپ مجھے سمجھتے کیوں نہیں؟ میں شہر میں رہنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ہم شہر کے مضافات میں سکونت اختیار کر لیں گے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب انٹرنیٹ اور موبائل فون کا زمانہ ہے۔ وقت نے بڑی تیزی سے کروٹ لی ہے۔ میں آپ کو اور اماں جی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ دوسری جانب مجھے اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ بابا آج کل اسکول کے بعد بچوں کی آن لائن کلاسز ہوتی ہیں جو کہ اس گاؤں میں ممکن نہیں ہے۔ مجھے بھی اپنے گاؤں بنجر پور سے بے حد پیار ہے۔ میرے ماضی کی یادیں بنجر پور سے جڑی ہوئی ہیں۔ بنجر پور سے دوری میرے دل میں ہمیشہ یادوں کی کسک بن کر بہت ستائے گی۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ بنجر پور کو چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ میں اپنے بچوں کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ نہیں کر سکتا۔ بابا میری بات مان لیں۔ یہاں کی ساری جائیداد بیچ کر ہم شہر کے مضافاتی علاقے

میں آرام سے اپنی زندگی بسر کریں گے''۔ فیض نے قدرے اطمینان سے اپنے والد کو رضامند کرنے کی کوشش کی۔

فیض خاں شہر سے تقریباً سو میل کی دوری پر پہاڑی علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں بنجر پور میں رہتا تھا۔ بنجر پور کے چاروں طرف سرسبز اور گھنے جنگل تھے۔ شہر جانے کے لیے جنگل سے ایک نیم پختہ پگڈنڈی کو عبور کر کے چھوٹے سے اسٹاپ سے گاڑی مل جاتی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے فوراً بعد فیض کو ایک سرکاری نوکری ملی اور شہر کے ایک دفتر میں تعینات ہوا۔ فیض شہر میں ایک کرایے کے مکان میں رہنے لگا اور ہفتے میں ایک آدھ بار گھر آ کر اپنے بوڑھے والدین کی خبر گیری کرتا رہتا تھا۔ فیض نے والدین کی مرضی کے مطابق شہر میں ہی شادی کر لی۔ شادی کے بعد بھی فیض مسلسل بنجر پور آتا جاتا رہا۔ دفتری کام اور بچوں کی تعلیم کے مسئلے نے فیض کو بنجر پور کو الوداع کہنے کے لیے مجبور کیا۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ یہ کام فیض کے والدین کی مرضی کے برعکس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کو اعتماد میں لینا فیض کے لیے کافی مشکل کام تھا اور فیض نے نہایت ہنر مندی کا اظہار کر کے بالآخر اپنے والدین کو بنجر پور سے ہجرت کر کے شہر کے مضافاتی علاقے میں ایک مکان خریدنے کے لیے رضامند کیا۔

بنجر پور سے رحیم خان کی ہجرت سے ایک خلا سا پیدا ہوا تھا۔ لوگ رحیم خان کے جانے سے کافی دل برداشتہ تھے۔ رحیم خان گاؤں میں ایک معزز انسان کی حیثیت رکھتا تھا۔ گاؤں میں کسی بھی مسئلے کو لے کر لوگ رحیم خان سے رائے پوچھتے تھے۔ رحیم خان بنجر پور کا ایک چہیتا آدمی تھا۔ رحیم خان کا بنجر پور سے ہمیشہ کے لیے ناطہ توڑنا گویا بنجر پور کی آبادی کو بے سکون کرنے کے مترادف تھا۔ بنجر پور کے لوگوں کی آنکھیں نم تھیں۔ رحیم خان کے دوست واحباب اس فیصلہ سے مضطرب تھے۔ لوگ رحیم خان کو گلے سے لگا کر زار و قطار رو رہے تھے۔ بنجر پور کا ہر فرد رحیم خان اور اس کے اہل وعیال سے آخری بار مل رہا تھا۔ رحیم خان جنگل کی پگڈنڈی پر بوجھل قدموں کے ساتھ شاید آخری بار چل رہا تھا۔

بس اسٹاپ سے رحیم خان کے لیے ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔ ایک ایسا سفر جس کے بارے میں رحیم خان نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ ایک ایسا سفر جس کی شروعات اس کی زندگی کے آخری لمحات میں ہوئی تھی۔ رحیم خان نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر فیض کا دل جیت لیا تھا۔ اپنی خوشی اور سکون کا گلا گھونٹ کر رحیم خان نے اپنے بیٹے کی خوشنودی کے لیے ایک عظیم قربانی کا فریضہ انجام دیا تھا۔

فیض نے بنجر پور کی ساری جائیداد بیچ کر شہر کے مضافات میں ماڈرن کالونی میں ایک عمدہ گھر خرید لیا تھا۔ نئے گھر میں ہر طرح کی سہولیات دستیاب تھیں۔ لابی میں نئے صوفے، ایک بڑا سمارٹ ٹیلی ویژن اور مصنوعی پھول دان سجے ہوئے تھے۔ فیض خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ آج وہ اپنے ہمراہ والدین کو اپنے عالیشان بنگلے میں لا رہا تھا، جو اس کی ایک آرزو تھی۔ فیض اپنے والدین کا فرمانبردار بیٹا تھا جس کا دل ماں باپ کی شفقت اور محبت سے لبریز تھا۔ رحیم خان ماڈرن کالونی میں قدم رکھتے ہی ایک الگ دنیا میں چلا گیا۔ اتنے عالیشان بنگلے رحیم خان نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ رحیم خان کافی دیر تک نئے نئے بنگلوں کو دیکھتا رہا اور اسی اثناء میں فیض اپنے والد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

''بابا۔۔۔ بابا۔ کہاں کھو گئے؟ یہ دیکھو اپنا مکان سامنے ہے''۔

اپنے مکان کے سوا رحیم خان کے لیے ماڈرن کالونی میں

سب کچھ پرایا تھا۔فیض نے عمدہ طریقے سے اپنے ماں باپ کا خیال تو رکھا،لیکن ان کے چہروں پر افسردگی کے نمایاں تاثرات صاف صاف عیاں تھے۔ یہاں کے لوگوں میں بنجر پور کی طرح پیار و محبت نہ تھی۔لوگ اپنے کام سے کام رکھتے اور ہر کوئی اپنے آپ میں بے حد مصروف تھا۔فیض صبح آفس کے لیے روانہ ہوتا اوراس کے والدین اس نئے بنگلے کی چار دیواریوں میں قیدی کی طرح اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ان کو ٹیلی ویژن سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔کبھی کبھار گھر سے باہر چہل قدمی کے لیے نکلتے تو راستے میں کوئی ان سے بات نہ کرتا، وہ ماڈرن کالونی میں ابھی تک اجنبی تھے۔فیض کی بیوی بھی فرمان بردار تھی، مگر رحیم خان اور اماں جی کے دل سے ان کے آبائی وطن کی یاد کو نہ نکال سکی۔

رحیم خان کے دل پہ ہجرت کا بڑا اثر گزرا۔کہاں بنجر پور کی وہ محفلیں اور کہاں ماڈرن کالونی کی تنہائیاں! بنجر پور کا خیال آتے ہی رحیم خان زور زور سے رونا چاہتا تھا مگر اس کی خشک آنکھوں سے آنسو نکلتے ہی نہیں تھے۔وہ اپنی زندگی سے بیزار تھا۔ وہ تنہائی کا شکار تھا۔رحیم خان کو بنجر پور کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی اور بہت ستا رہی تھی۔

گاؤں کے بل کھاتے راستے جن کے ننگے سینوں پر پت جھڑ میں درختوں سے گرے ہوئے زرد پتوں کا قالین بچھا رہتا اور موسم سرما میں وہ راستے سفید برف تلے دب جاتے تھے اور بہار کی آمد کے ساتھ ہی سارے راستے ایک بار پھر سے نمودار ہو جاتے۔رحیم خان کو بنجر پور کے جنگلوں کی وہ سرسراتی ہوئی ہوا یاد آ رہی تھی جس کی مدھم آواز سے اس پر اکثر نیند غالب آ جاتی تھی۔

رحیم خان زیادہ دنوں تک یہ صدمہ برداشت نہ کر پایا اور اندر ہی اندر بیماری نے رحیم خان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔کافی علاج و معالجہ کے بعد بھی رحیم خان کی طبیعت میں کوئی سدھار نہ آیا۔

بسترِ مرگ پر لیٹے رحیم خان کی عیادت کے لیے ماڈرن کالونی سے ایک بھی فرد نے آنے کی زحمت نہ کی۔بنجر پور سے جڑی اپنے ماضی کی یادوں میں کھوئے رحیم خان کی روح دھیرے دھیرے جسم چھوڑ رہی تھی۔ رحیم خان نے برف کی سفید چادر تلے دبے راستوں اور کھیت کھلیانوں کو آخری بار اپنی آنکھوں اور روح میں اتارنے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔وہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔ ماڈرن کالونی میں رحیم خان کے مرنے کی دی گئی۔فیض پرنم آنکھوں سے محلے کے عمر رسیدہ گورکن عیدے کے ہمراہ قبرستان میں اپنے والد کے لیے قبر کھودنے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ اسی اثناء میں ماڈرن کالونی کی محلّہ کمیٹی کے سربراہ حاجی ثناء اللہ نے قہر آلود نظروں سے گورکن عیدے کو دیکھا اور اسے قبر کھودنے سے روک دیا۔حاجی ثنائاللہ نے تیکھے لہجے میں کہا:

’’عیدے۔۔۔۔۔۔۔!! یہ قبرستان کسی کی ایرے غیرے کی آبائی ملکیت نہیں ہے۔ یہ لوگ پتہ نہیں کہاں سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں؟ اس قبرستان پر ان کا کوئی حق نہیں ہے۔ رحیم خان کسی بھی صورت میں اس قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا، جلدی سے یہ قبرستان خالی کرو‘‘

’’جناب! یہ قبرستان تو اہل اسلام کی ملکیت ہے اور الحمدللہ ہم مسلمان ہیں۔ہم آپ کے بھائی ہیں۔ایسا ظلم نہ کریں۔حاجی صاحب میرے بابا کی بے جان لاش جنازے کے انتظار میں ہے۔آپ چاہیں تو محلے کمیٹی میں مجھے بھی شامل کر لیں اور جو بھی

رقم طے ہوگی میں ادا کرنے کے لیے تیار ہوں'' فیض ثناءاللہ کے سامنے التجا کررہا تھا۔

''نہیں ایسا بالکل نہیں ہوسکتا۔ یہ ہمارے اصولوں کے برعکس ہے۔ ہم قطعی دوسری برادری کی میت کو اپنے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ جب آپ نے اس بستی میں مکان خریدا تو اس وقت اپنی رہائش کا بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مردوں کی تدفین کا بھی بندوبست کیا ہوتا تو کافی اچھا رہتا'' حاجی ثناءاللہ کا انکار واضح تھا۔

فیض خان حاجی ثناءاللہ کے سامنے نہایت عاجزی سے گڑگڑایا مگر حاجی صاحب پر اس کی انکساری بے اثر ثابت ہوئی۔ قبرستان کا دروازہ بند کردیا گیا اور فیض کو وہاں سے نکال دیا گیا۔

کفن میں لپٹی رحیم خان کے لئے محض دو گز زمین کے ٹکڑے کی تلاش تھی۔ فیض ماڈرن کالونی میں پاگلوں کی طرح ہر ایک سے التجاء کررہا تھا۔ وہ اب اپنے بابا کے لیے الگ سے قبرستان خریدنا چاہتا تھا اور اس چیز کے لیے وہ منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار تھا۔ حاجی ثناءاللہ کو اس بات کی بھنک لگ گئی۔ اس نے ڈھونڈتے ڈھونڈتے فیض کو مسجد کے احاطے میں پایا۔ ثناءاللہ نے پیار سے فیض کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہنے لگا:

''فیض بیٹے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں محلّہ کمیٹی کا سربراہ ہوں اور میں اصولوں کی خلاف ورزی بالکل بھی نہیں کرسکتا۔ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ آپ میرے بیٹے جیسے ہو۔ میری مجبوری کو سمجھو۔ میں محلے والوں کو کیا جواب دوں گا۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اب میں نے بہت غور و فکر کے بعد اپنی تھوڑی سی زمین آپ کو بیچنے کا ارادہ کیا ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں، میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے''

حاجی صاحب کی باتیں سن کر فیض کو کچھ حد تک راحت نصیب ہوئی اور اس نے فوراً زمین خریدنے کی حامی بھر لی۔ حاجی ثناءاللہ نے مزید کہا:

''دیکھو فیض بیٹے مسجد کے پیچھے جو زمین ہے، وہ میری ہے۔ کسی زمانے میں سرکاری زمین ہوا کرتی تھی لیکن میں نے کافی تگ و دو کے بعد اس پر اپنا قبضہ قائم کیا۔ اسی میں سے تھوڑی سی زمین بیچ رہا ہوں۔ آپ تین لاکھ روپے کا بندوبست کریں اور میت کی تدفین میں دیری نہ کریں کیونکہ تدفین میں دیر کرنا گناہ عظیم ہے۔''

فیض نے بوجھل دل سے حاجی ثناءاللہ کی پیشکش قبول کی اور دو گواہان کی موجودگی میں تعزیت کے دن گزر جانے کے بعد تین لاکھ روپیہ ادا کرنے کا اقرار کرلیا۔

حاجی صاحب نے مسجد میں لاؤڈ سپیکر پر رحیم خان کی نماز جنازہ کے لیے محلے کے لوگوں کو مدعو کیا۔ رحیم خان کے جنازے کو کاندھا دینے والوں کی ایک بڑی تعداد نمودار ہوئی۔ مسجد کے احاطے میں حاجی ثناءاللہ کی امامت میں رحیم خان کا نماز جنازہ ادا کی گئی اور رحیم خان کی میت کو مسجد کے پیچھے دفن کیا گیا۔

تعزیت کے دن گزرنے کے بعد فیض نے اپنی زوجہ کا زیور بیچ کر حاجی ثناءاللہ کے گھر جاکر گواہان کی موجودگی میں تین لاکھ روپیہ اس کے حوالے کیے اور کچھ مدت بعد اس تھوڑی سی زمین کی حد بندی کرکے وہاں ''قبرستان برائے اہلیانِ بنجر پور'' کا بورڈ لگادیا۔

❖❖❖

Fazil Shafi Bhat
Vill&Post Akingam,
District- Anantnag
J&K-192201
Mob. 9971444589

غزل

عشق میں دل مجبور بہت ہے
تیرے جہاں سے دور بہت ہے

پیار کی باتیں، چھیڑ نہ ہمدم
قلب مرا رنجور بہت ہے

دید کو ترسے، آنکھ پریشاں
لب سے تبسم دور بہت ہے

دیکھ قدم رکھ، سوچ سمجھ کر
راہ وفا مخطور بہت ہے

ختم سفر ہو، شام سے پہلے
کوئی تھکن سے چور بہت ہے

شیخ کا کہنا وعظ میں اپنے
خلد کی مجھ کو حور بہت ہے

مے کی کرامت، ساری ہے انجم
چہرہ جو پرنور بہت ہے

فریدہ انجم

Fareeda Anjum
Tarni Prasad Lane
Near, Chhoti Masjid
Patna City-8, PATNA-800008
Mob:8235851828

غزل

نظر نظر سے ملے اور کلام ہو جائے
کسی کا لب نہ کھلے اور سلام ہو جائے

غزالی آنکھیں غزل بات خوشنما چہرا
تجھے جو دیکھ لے تیرا غلام ہو جائے

اٹھیں اگر تیری پلکیں تو صبح روشن ہو
بکھیر دے تو جو زلفیں تو شام ہو جائے

نکل کے چھت پہ اگر بے حجاب آ جاؤ
تو شرمسار یہ ماہِ تمام ہو جائے

تمہارے نام کی نسبت جسے میسر ہو
اسے ہے زیب کہ صد احترام ہو جائے

بناؤ لفظوں کی تصویر اس طرح اطہرؔ
تری غزل ترا شیشہ و جام ہو جائے

ڈاکٹر اطہر صغیر

Dr. Athar Sagheer
Vill. Tikariya, P.O. Kasamhi
Distt. Siddharth Nagar, UP
Pin.272189. Mob. 7607480388

تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجنا لازمی ہے

خبرنامہ تبصرہ

نام کتاب	:	بزم رفتہ
مرتب وناشر	:	محمد اویس سنبھلی
صفحات	:	280
قیمت	:	320 روپئے
مطبع	:	نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنؤ
ملنے کا پتہ	:	الفرقان بکڈ پو، نظیر آباد، لکھنؤ
مبصر	:	ڈاکٹر محمد سعید اختر

محمد اویس سنبھلی صاحب کا شمار اردو ادب کے نوجوان ادیبوں اور قلم کاروں میں ہوتا ہے، ان کے بارے میں کئی اہم اور بڑی شخصیات نے اپنا اظہار خیال کیا ہے اور ان کی کتابوں پر گراں قدر تبصرے بھی کیے ہیں، جو ان کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہیں اور ان کی خدمات سے روشناس کراتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''بزم رفتہ'' مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی وفیاتی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ مولانا ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی یہ وفیاتی تحریریں ماہنامہ ''الفرقان'' ہفت روزہ ندائے ملت اور دیگر مجلّات میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ انھیں یکجا کر کے جناب اویس سنبھلی نے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔ مولانا کی وفیاتی تحریروں میں دینی، علمی، سیاسی، سماجی اور دیگر شعبوں سے وابستہ شخصیات شامل ہیں۔

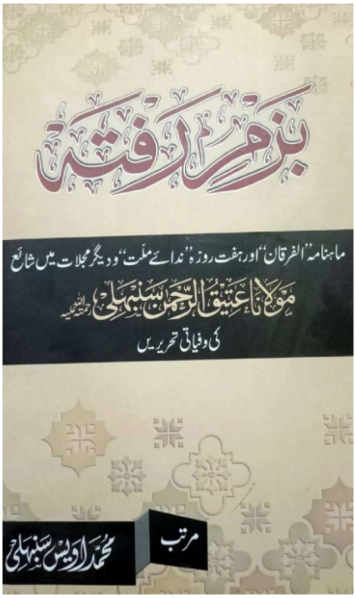

وفیات نگاری میں مولانا کا اسلوب اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے نہایت اختصار کے ساتھ ان وفیاتی تحریروں کو لکھا ہے، جن میں ان کے اصل کمالات ومحاسن کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مولانا کی یہ تحریریں وفیات نگاری میں اہم درجہ رکھتی ہیں۔ ان تحریروں کی خوبی یہ ہے کہ ہر شخصیت کے کردار وصفات قاری کے سامنے بہت اچھے پیرائے میں آتے ہیں۔ علمی اور دینی شخصیات میں مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا فہیم الدین میرٹھی، مولانا شاہ عبد القادر سیوہاروی، مولانا یعقوب، مولانا احسن اصلاحی وغیرہ پر لکھی گئیں تحریریں اپنی مثال آپ ہیں۔ سیاسی وسماجی شخصیات پر لکھی گئی وفیاتی تحریروں میں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، شاہ فیصل اور یاسر عرفات اہم ہیں۔ شاہ فیصل پر لکھی گئی وفیاتی تحریر اس کتاب کی سب سے ضخیم تحریر ہے جو 13 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تحریر سے جہاں شاہ فیصل کی شخصیت، خدمات اور کارنامے کا پتا چلتا ہے وہیں مولانا کا اسلوب بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی شخصیت ہمہ جہت تھی، انھیں اپنے والد ماجد مولانا منظور نعمانی سے والہانہ محبت اور عقیدت تھی۔ ان کا تذکرہ بھی انھوں نے صرف تین صفحات میں کیا ہے، لیکن اتنے میں ہی ان کا قلم پوری روانی سے بہتا چلا گیا ہے اور قاری بس اس میں کھو سا جاتا ہے۔

ادبی شخصیتوں میں مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا نسیم احمد فریدی، پروفیسر خلیق احمد نظامی خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ مولانا مسعود عالم کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

''مرحوم ایک قابل قدر شخصیت کے مالک تھے۔ان کا علم وفضل ہندوستان و پاکستان ہی میں نہیں عالم اسلامی میں بھی مانا جاتا تھا... اردو اور عربی پر یکساں قدرت رکھتے تھے، زبان میں لکنت تھی، اس لیے ان کے اصل جوہر تحریر میں کھلتے تھے، اپنے دیرینہ دوستوں کے بیان کے مطابق شرافت ومروت کا نمونہ تھے۔'' (ص73)

کتاب کے مشمولات میں 62 وفیاتی تحریروں کے علاوہ پیش نامہ (محمد اویس سنبھلی) مقدمہ (محمد یحییٰ نعمانی) تعارف (حکیم وسیم احمد اعظمی) صدائے دل (مولانا ضیاء الحق خیرآبادی) مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا مختصر سوانحی خاکہ (محمد اویس سنبھلی) شامل ہیں۔تحریروں کی ترتیب میں زمانی اعتبار کا خیال رکھا گیا ہے۔ کتاب کے مرتب محمد اویس سنبھلی، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کے بھانجے ہیں۔مرتب کتاب کی حیثیت سے محمد اویس سنبھلی کا تفصیلی مقدمہ پیش نامہ کے عنوان سے اور مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا سوانحی خاکہ شامل ہے جو پرمغز اور معلوماتی بھی ہے، جس کے پڑھنے سے قاری کو اس کتاب اور مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب کے بارے میں بہت ساری معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔

وفیات نگاری میں مولانا کا اسلوب خاص امتیاز رکھتا ہے۔ انھوں نے ان تحریروں میں اختصار کا خاص خیال رکھا ہے۔ جن شخصیات کے بارے میں بھی انھوں نے لکھا ہے ان کے اصل کمالات اور حالات کا ذکر کیا ہے جو قابل قدر اور اہم ہوں۔اسی سلسلے میں حکیم وسیم احمد اعظمی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''مولانا کی وفیاتی تحریروں کا بیانیہ ایجاز واختصار سے عبارت ہے، ان کے یہاں اس کا کوئی متعین اسلوب نہیں ہے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ بھی بہت وقیع ہے اور اس میں لسانیاتی تنوع بھی ہے۔'' (ص27)

زیر تبصرہ کتاب ''بزم رفتہ'' محمد اویس سنبھلی کی مرتب کردہ کتابوں میں دسویں کتاب ہے۔اس کتاب کے علاوہ ان کی نو کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔جن میں ''اعتراف سعادت (ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی حیات وخدمات پر مشتمل مضامین کا مجموعہ)، کاوشیں (مجموعہ مضامین)، بجھے دیوں کی قطار (حفیظ نعمانی کے خاکوں سے انتخاب) قلم کا سپاہی حفیظ نعمانی (حفیظ نعمانی کی حیات وخدمات پر مشتمل مضامین)، باغ سنبھلی کی شعری کائنات (حضرت داغ دہلوی کے جانشین محمد فضل رب باغ سنبھلی کا غیر مطبوعہ کلام)، افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری (حیات اللہ انصاری کے افسانوی ادب پر مشتمل مقالات کا مجموعہ) نذر شارب (پروفیسر شارب ردولوی کے علمی وادبی کارناموں پر مشتمل مضامین کا مجموعہ) حفیظ نعمانی: ایک عہد ایک تاریخ'' اور ''بندۂ مومن'' اہمیت کی حامل ہیں اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جارہی ہیں۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے ایک سرگرم علمی اور ادبی زندگی گزاری تھی، یہ کتاب اس لحاظ سے اور بھی اہم ہے کہ اس میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے جن شخصیات کی وفیات تحریر کی ہے ان کے اہم گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔اس لیے ان کی یہ تحریریں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

کتاب کے مرتب محمد اویس سنبھلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرے گی۔کتاب کی قیمت بھی مناسب ہے۔امید ہے قارئین پسندیدگی کا اظہار کریں گے۔

❖❖❖

Dr Mohd Saeed Akhtar
H.N. 613/P-18 Kha, Gaur bheet
Millat Nagar Road,
Faizullah Ganj-II, Lucknow-226013
Mob.8750157156

علمی و ادبی خبریں

شعری مجموعہ 'گنجینہ' کا اجرا

لکھنؤ۔ اودھ ریزیڈنسی ون وائس ٹرسٹ کے تحت شعری مجموعہ 'گنجینہ' کا اجرا یکم فروری ۲۰۲۵ء کو ہوا جس میں یاسمین اظہر، جمال اظہر سائرہ خاتون اور تبسم فاطمہ کی غزلیں شامل ہیں۔ کتاب کا اجرا اطہر نبی ایڈوکیٹ، سینئر صحافی شکیل حسن شمسی اور سابق کھلاڑی سید رفعت کے بدست عمل میں آیا۔ اس موقع پر حسن کاظمی، ضیاء محمود آبادی، مظہر سعید اور ڈاکٹر شویتا شریواستو وغیرہ نے اشعار سنائے۔

طیب عثمانی کی یاد میں مشاعرہ کا اہتمام

لکھنؤ۔ بزم لاریب کے تحت بزم کے دفتر میں ۵ فروری کو طیب عثمانی کی یاد میں مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت رحمت لکھنوی اور نظامت ابوہریرہ عثمانی نے کی۔ بطور مہمان خصوصی یقین فیض آبادی نے شرکت کی۔ صدر مشاعرہ رحمت لکھنوی نے کہا کہ مرحوم طیب عثمانی نے اپنی شاعری اور اپنے اخلاق کے ذریعہ منفرد مقام بنایا تھا۔ نعتیہ شاعری کے حوالے سے ان کی دور تک شناخت تھی۔ یقین فیض آبادی نے کہا کہ طیب عثمانی نے لکھنؤ کے کئی شعراء کو قصبات میں متعارف کرایا۔ واصف رشید نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی بقا و فروغ کے لئے اردو رسائل و اخبارات کو خرید کر پڑھنا چاہئے۔ اس موقع پر رحمت لکھنوی، یقین فیض آبادی، شکیل گیاوی، ڈاکٹر ہارون رشید، ڈاکٹر اقبال حسین، آفتاب اثر ٹانڈوی، محسن عظیم، فاروق عادل، عامر مختار اور سلیم تابش وغیرہ نے اپنے اشعار سنائے۔

چوراچوری تحریک کی سالگرہ پر مشاعرہ

گورکھپور۔ انصار ادبی سوسائٹی کے تحت چوراچوری تحریک کی سالگرہ پر ۵ فروری کو عمران دانش کے مکان پر مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر کی ادبی و سماجی شخصیات نے شرکت کی۔ صدارت سرور جمال نے اور نظامت حافظ ناصرالدین ناصر نے کی۔ کنوینر اسرارالحق اور کوآرڈینیٹر عمران دانش نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ مشاعرہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے اسرارالحق نے کہا کہ چوری چورا انقلاب کے ہیرو شہید عبداللہ انصاری اور ان کے سیکڑوں ساتھیوں کی قربانیوں کے ذکر کے بغیر تحریک آزادی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ مشاعرہ میں حافظ ناصر الدین انصاری، بسمل نوری، صدیق مجاز وغیرہ نے کلام پیش کیا۔

بزرگ شاعر محمد احمد فتح پوری کے انتقال پر اظہار تعزیت

سیتاپور۔ بزم وقار ادب کے جنرل سکریٹری قمر سیتاپوری نے بزرگ شاعر ڈاکٹر محمد احمد فتح پوری کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نے اردو ادب کی جو بے لوث خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش اور قابل ستائش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم احمد فتح پوری منکسر المزاج، شریف النفس اور صوم وصلاۃ کے پابند تھے۔ ہندو۔مسلم اتحاد اور گنگا جمنی تہذیب کے سچے علمبردار تھے۔ انکساری اور خودداری ان کے خمیر میں شامل تھی۔ ان کی رحلت سے فتح پور ایک معتبر شاعر اور مخلص شخصیت سے محروم ہوگیا۔

قارئین کے خطوط

مدیر محترم!

خبر نامہ کی پوری ٹیم کا بہت بہت شکریہ اتنا بہترین رسالہ ہم تک پہونچانے کے لئے۔اس وقت میرے ہاتھوں میں ماہ دسمبر ۲۰۲۴ء کا شمارہ ہے۔کم صفحات میں مختصر اور متنوع مضامین کے ساتھ ہی غزلوں کا بہترین انتخاب ہے۔افسانہ بھی ہے،علمی وادبی خبریں بھی اور کتابوں پر تبصرہ بھی۔جاوید ساحل صاحب نے شاعرؔ فتح پوری کے نعتیہ مجموعہ ’نقش محبت‘ کا بہترین تجزیہ کیا ہے۔خاص طور سے شاعر فتح پوری کے یہ اشعار دل کو بھا گئے:

مدحت سرور کونین لکھوں میں شاعرؔ
تا کہ ہوجائے سر حشر شفاعت میری

ہم اپنی زندگی میں روضہ اقدس کو دیکھ آئیں
مدینہ ہے جدھر ہم کو ادھر جانے کا موقع دو

مضمون نگار نے بہت جامع انداز میں ’نقش محبت‘ کا تعارف پیش کیا ہے۔منظومات کے حصہ میں صفی انوریانی،فرزانہ پروین، ڈاکٹر زرینہ بیگم، عامر عطا،فوزیہ اختر ازکیٰ ، رضوان احمد فاروقی و طلحہ تابش سبھی کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔سبھی کو مبارکباد۔

شبنم قدسی، بنارس

مدیر محترم!

نومبر اور دسمبر کے ماہنامہ خبر نامہ کے شمارے دستیاب ہوئے۔ بہت عنایت۔رسالہ ماشاء اللہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے خوبصورت ہوگیا ہے۔نومبر ماہ کے خبر نامہ میں ڈاکٹر کہکشاں کے مضمون ’’جنگ، میزائل اور محبت: ایک تجزیاتی مطالعہ‘‘ نے اپنے عنوان کی وجہ سے خاص طور متوجہ کیا۔پڑھنے پر معلوم ہوا کہ یہ کسی ناول کا نام ہے۔ڈاکٹر کہکشاں نے ناول کا جس انداز سے تجزیہ کیا ہے اس سے پورے ناول کا منظر نامہ سامنے آگیا۔ہم لوگ کئی برسوں سے روس-یوکرین جنگ اور اس جنگ میں دنیا کی بڑی طاقتوں کی درپردہ شمولیت کو دیکھ رہے ہیں۔یہ ناول روس-یوکرین جنگ ہولناکی کو بیان کرتا ہے جس میں ناول نگار نے بم کے گولوں کے درمیان بھی انسانیت کے زندہ رہنے کا امیدافزا پیغام دیا ہے۔اسی طرح نومبر کے شمارہ میں ڈاکٹر عبدالغفار فاروقی کے افسانہ ’انسانیت‘ نے بھی متاثر کیا۔افسانہ پڑھتے وقت دو الگ الگ مذاہب کے کرداروں کے نام سامنے آنے پر اندازہ نہیں ہوسکا کہ کہانی کون سی کروٹ لے گی لیکن افسانہ کے اختتامیہ نے بہت اچھا تاثر چھوڑا۔دسمبر کے ہی شمارہ میں شبانہ عشرت کا مضمون ’’محنت کش طبقہ کا نمائندہ شاعر: ساحر لدھیانوی‘‘ مرحوم شاعر کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ساحر کی محبتوں کے قصے بہت مشہور ہیں۔خاص طور سے معروف ادیبہ امریتا پریتم سے ان کے محبت کا قصہ ہر کوئی جانتا ہے۔فطری طور پر ان کے قلم سے صرف اور صرف محبت کے نغمے ہی نکلنے چاہیئے تھے لیکن محبت ساحر کے دل کی بات ہے اور انھوں نے اس ڈگر سے ہٹ کر فلموں کے لئے جو نغمے لکھے وہ دراصل ان کا نظریہ تھا۔ ان کے دل میں انسانیت کا درد بسا ہوا تھا۔مضمون نگار نے ساحر کی شاعری کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔

ریحانہ خاتون
سنٹرل، ممبئی

’’قارئین کے خطوط‘‘

اس کالم میں ’خبر نامہ‘ میں شائع نگارشات پر آپ کی آراء اور تبصروں کو ترجیحی بنیاد پر شائع کیا جائے گا۔آپ اپنے خطوط وہاٹس ایپ نمبر 9450450484 پر بھی بھیج سکتے ہیں۔

U.P. Urdu Akademi
Khabarnama
उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा
اُتر پردیش اُردو اکادمی خبر نامہ
Vol. No. 53 March 2025 Issue No. 9

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں / دار المطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہنامہ ''خبر نامہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار / سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ اقلیتی طلباء کو ''سول سروسیز کی تیاری کے لئے اردو آئی-اے-ایس-اسٹڈی سینٹر'' اور ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر۔

یونیورسٹی سطح کی نصابی کتابیں

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
-1	ادب پارے (نثر)	سید احتشام حسین	45/=	-10	انتخاب منظومات (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	55/=
-2	ادب پارے (نظم)	سید احتشام حسین	45/=	-11	'' نثر (حصہ اول)	مجلس مشاورت	62/=
-3	انارکلی	امتیاز علی تاج	43/=	-12	'' نثر (حصہ دوم)	مجلس مشاورت	78/=
-4	انتخاب افسانہ	مجلس مشاورت	134/=	-13	بکٹ کہانی	نور الحسن ہاشمی	45/=
-5	'' خطوط غالب	مجلس مشاورت	28/=	-14	لازمی نصاب	حکم چند نیر	46/=
-6	'' غبار خاطر	ابو الکلام آزاد	70/=	-15	معیاری نثر و نظم	حامد ندیم	73/=
-7	'' قصائد	مجلس مشاورت	64/=	-16	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	135/=
-8	'' مراثی	مجلس مشاورت	120/=	-17	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/=
-9	'' منظومات (حصہ اول)	مجلس مشاورت	54/=				

شخصیات سیریز

نمبر شمار	نام کتاب	مرتب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	مرتب	قیمت
-1	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	438/=	-10	سالک لکھنوی	پروفیسر مظفر حنفی	216/=
-2	ندا فاضلی	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=	-11	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر ذکی طارق	216/=
-3	کلیم عاجز	ر ر مناظر عاشق ہرگانوی	288/=	-12	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر توقیر احمد خاں	245/=
-4	زبیر رضوی	ڈاکٹر مہتاب امروہوی	262/=	-13	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/=
-5	نشتر خانقاہی	اسد رضا	260/=	-14	حفیظ میرٹھی	ڈاکٹر تابش مہدی	245/=
-6	ساغر خیامی	ناشر نقوی	215/=	-15	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/=
-7	مظہر امام	امام اعظم	208/=	-16	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/=
-8	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	233/=	-17	معراج فیض آبادی	ڈاکٹر کلیم قیصر	245/=
-9	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/=				

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010
سیلس ڈپو : 0522-4022924
Website:www.upurduakademi.in E-mail:upurduakademi3@gmail.com